حکیم الامت کے سیاسی افکار

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

حکیم الامتؒ کے سیاسی افکار

شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
کے سیاسی افکار

حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبے میں جو عظیم خدمات لیں ان کی نظیر ماضی کی کئی صدیوں میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی دینی ضرورت کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا کوئی مفصل یا مختصر کلام موجود نہ ہو۔ حضرت کی تصانیف، مواعظ اور ملفوظات اپنے دور کی دینی ضروریات پر مشتمل ہیں، اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دین کی تعلیمات کو انہوں نے کسی نہ کسی شکل سے واضح کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

اس وقت میرے پیش نظر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سیاسی افکار کی تشریح و توضیح ہے۔ اگرچہ حضرت کی شخصیت کسی بھی حیثیت سے کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھی اور نہ سیاست آپ کا خصوصی موضوع تھا، لہٰذا آپ کی کوئی تصنیف خالصتاً سیاست کے موضوع پر موجود نہیں ہے، لیکن چونکہ اسلام کے احکام دین کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست سے بھی متعلق ہیں اس لئے اسلامی احکام کی تشریح و وضاحت کے ضمن میں حضرت نے اسلام کے سیاسی احکام پر بھی اپنی تصانیف اور مواعظ و ملفوظات میں مختصر مگر جامع بحثیں فرمائی ہیں جن میں اسلامی احکام کی توضیح کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے دوسرے سیاسی نظاموں اور سیاست کے میدان میں پائی جانے والی فکری اور عملی گمراہیوں پر بھی

بھرپور تبصرے شامل ہیں۔ اس مقالے میں انہی بحثوں کا ایک ایسا مطالعہ مقصود ہے جس کے ذریعے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بیان کے مطابق سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک واضح تصور ابھر کر سامنے آسکے۔

آج کی دنیا میں جو سیاسی نظام عملاً قائم ہیں' ان کے پیش کیے ہوئے تصورات لوگوں کے دل و دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے اثرات سے اپنی سوچ کو آزاد کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ان سیاسی نظاموں نے کچھ چیزوں کو اچھا اور کچھ کو برا قرار دے کر اپنے ان نظریات کا پروپیگنڈا اتنی شدت کے ساتھ کیا ہے کہ لوگ اس کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اول تو اس لئے کہ پروپیگنڈے کی مہیب طاقتوں نے ذہن ہی ایسے بنا دیئے ہیں کہ انہوں نے ان نظریات کو ایک مسلم سچائی کے طور پر قبول کر لیا ہے' اور دوسرے اس لئے کہ اگر کوئی شخص عقلی طور پر ان نظریات سے اختلاف بھی رکھتا ہو تو ان کے خلاف کچھ بولنا دنیا بھر کی ملامت اور طعن و تشنیع کو دعوت دینے کے مترادف ہے' لہٰذا وہ خاموشی ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔

اس بناء پر جب آج کی دنیا میں اسلام کی سیاسی تعلیمات کی تشریح کی جاتی ہے تو اچھے اچھے لوگ (جن میں بہت سے علماء بھی داخل ہیں) اپنے ذہن کو زمانے کے ان فیشن ایبل تصورات سے آزاد نہیں کر پاتے' اور اس کے نتیجے میں جب وہ اسلام کے مطلوب سیاسی ڈھانچے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو ان تصورات کو مستعار لے کر اس ڈھانچے میں فٹ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور اس طرح اس نازک موضوع پر التباس اور خلط مبحث کی اتنی تہیں چڑھتی چلی گئی ہیں کہ حقیقت حال چھپ کر رہ گئی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے چودھویں صدی میں دین کی تجدید کا عظیم الشان کام لیا' اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس پر قرآن و سنت اور ماخذ شریعت کا پختہ رنگ اس طرح چڑھا ہوا ہو کہ کوئی دوسرا رنگ اس پر نہ چڑھ سکے۔ ایسا شخص زمانے کو جاننا ضرور ہے' لیکن قبول وہی کرتا ہے جو اس پختہ

رنگ کے مطابق ہو۔ وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتا ہے' لیکن گردو پیش میں ہونے والے پروپیگنڈے کے شور و شغب سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا کسی ایک سمت میں چلی جائے تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے اسی بات پر ڈٹا رہتا ہے جو ماخذ شریعت کی رو سے سچی اور کھری بات ہو' اور اس کے اظہار میں کوئی مرعوبیت یا شرم یا مخلوق کا خوف اس کے آڑے نہیں آتا۔

سیاست کے معاملے میں بھی حکیم الامت قدس سرہ نے دین کی صراط مستقیم پر اسی ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا' اور اس دور میں جب بہت سے باطل نظریات کی آمیزش نے سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو دھندلا کر دیا تھا' حضرت نے اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے ان تعلیمات کو اپنی صحیح شکل و صورت میں پیش کیا اور پروپیگنڈے کے کسی شور و شغب سے مرعوب نہیں ہوئے۔

چونکہ آج کل کی سیاست (جس میں وہ سیاست بھی داخل ہے جس کا مقصد اسلام کا نفاذ بتایا جاتا ہے) ایک خاص رخ پر چل رہی ہے' اور اس میں بعض باتوں کو اصول موضوعہ کے طور پر اس طرح مسلم سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے خلاف کا تصور ہی ذہنوں میں نہیں آتا' اس لیے حضرت کے یہ سیاسی افکار ان سیاسی ذہنوں کو یقیناً اچنبھے محسوس ہوں گے جو بنیادی طور پر مغربی انداز سیاست سے متاثر ہیں۔ لیکن حضرت کے یہ افکار آپ کے ذاتی افکار نہیں ہیں' بلکہ ان کی بنیاد قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کے طرز عمل پر ہے اور ان کے پیچھے نقلی اور عقلی دلائل کی مضبوط طاقت ہے' اس لئے ان کا مطالعہ اور ان پر ٹھنڈے دل اور غیر جانبدار ذہن سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ حقیقت حال واضح ہو سکے۔

حضرت کے سیاسی افکار کو میں تین حصوں میں منقسم کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

(ا) اسلام میں سیاست کا مقام۔

(۲) اسلام کا نظام حکومت اور حکومت کے فرائض۔

(۳) اسلام میں سیاسی جدوجہد کا طریق کار۔

(۱) اسلام میں سیاست کا مقام

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دین میں سیاست کا مقام کیا ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے؟ عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور ہے کہ "قیصر کا حق قیصر کو دو' اور کلیسا کا حق کلیسا کو" جس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے' اور مذہب و سیاست دونوں کا دائرہ عمل مختلف ہے' دونوں کو اپنے اپنے دائرے میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر کام کرنا چاہئے' دین و سیاست کی تفریق کا یہی نظریہ عہد حاضر میں ترقی کر کے "سیکولرزم" کی شکل اختیار کر گیا جو آج کے نظام ہائے سیاست میں مقبول ترین نظریہ سمجھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اسلام کی تعلیمات چونکہ ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے' اس لیے اسلام میں سیاست کو دین و مذہب سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

چنانچہ عہد حاضر میں بہت سے مسلمانوں نے عیسائیت اور سیکولرزم کے اس باطل نظریے کی پر زور تردید کی' اور یہ ثابت کیا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا' بقول اقبال مرحوم۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لیکن سیکولرزم اور دین و سیاست کی تفریق کے اس نظریے کی پر زور تردید کرتے ہوئے بہت سے مسلمان مفکرین اور اہل قلم سے ایک نہایت باریک غلطی واقع ہو گئی جو دیکھنے میں بڑی باریک اور معمولی تھی' لیکن اس کے اثرات بہت دور رس تھے۔ اس باریک غلطی کو ہم مختصر لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اسے اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں کہ

انھوں نے "سیکولرزم" کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنادیا' کہنا یوں تھا کہ "سیاست" کو دین سے الگ نہ ہونا چاہیے' لیکن کہا یوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست و حکومت سے متعلق ضرور ہیں اور ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدر استطاعت عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے' حاکم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکام کو نافذ کرے' اور انہی احکام کے مطابق حکومت کرے' اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش اور اگر وہ قائم ہو جائے تو اس کی اطاعت کریں۔

لیکن عہد حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین جنہوں نے سیکولرزم کی تردید میں کام کیا' تردید کے جوش میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے سیاست اور حکومت کو اسلام کا مقصود اصلی' اس کا حقیقی نصب العین اور بعثت انبیاء کا مطمع نظر' بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دے دیا' اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کو نہ صرف ثانوی حیثیت دے دی' بلکہ انھیں اسی مقصود اصلی' یعنی سیاست کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیدیا۔

اس انتہاپسندی کا پہلا زبردست نقصان تو یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویر اور اس کی ترجیحات کی ترتیب (Order of Priority) الٹ کر رہ گئی' جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن کر ہمہ وقت دل و دماغ پر چھاگئی' اور جو مقصد تھا' ایک غیر اہم وسیلہ بن کر پس منظر میں چلا گیا' چنانچہ اس طرز فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح کا بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصد زندگی سیاست اور حکومت کی اصلاح ہونا چاہیے' کام وہی کام ہے جو اس راستے میں انجام دیا جائے' قربانی وہی قربانی ہے جو اس راہ میں پیش کی جائے' اور مثالی انسان وہی ہے جس نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناکر دن رات اس

کے لئے وقف کر رکھے ہوں۔ اور دین کے دوسرے شعبوں مثلاً طاعات و عبادات، زہد و تقویٰ، تزکیۂ نفس اور خشیت و انابت وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی، بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہو اس کے بارے میں یہ تصور قائم کر دیا گیا کہ گویا وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے اور دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصد اصلی سیاست و حکومت قرار پایا، اور عبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت محض وسیلے کی ہوگئی، تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان بھی کرنا پڑتا ہے، اور مقصد کے حصول کے لئے اگر کبھی کسی وسیلے میں کچھ اونچ نیچ یا کمی بیشی بھی ہو جائے تو وہ گوارا کر لی جاتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ انتہا پسندی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہوگئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی بھی ہو جائے تو وہ قابل ملامت نہیں کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہوئی ہے۔

سیاست کو دین کا ایک شعبہ نہیں، بلکہ دین کا مقصود اصلی قرار دینے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تجارت و معیشت بھی دین کا ایک شعبہ ہے، اس حیثیت سے دین کے بہت سے احکام تجارت و معیشت سے بھی متعلق ہیں بلکہ کسب حلال کے بہت سے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اب اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت و معیشت اور کسب حلال ہے، تو یہ بات اتنی غلط ہوگی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بعینہٖ اسی طرح سیاست اس معنی میں دین کا ایک شعبہ ضرور ہے کہ دین کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں، اور اس کے بہت سے فضائل بھی قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں لیکن ان فضائل کی بنیاد پر اس کو دین کا مقصود اصلی قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسے تجارت و معیشت کو دین کا اصل نصب العین قرار دینا۔

لیکن چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں جب سے مسلمانوں میں مغربی

استعمار سے آزاد ہونے کی تحریکات شروع ہوئیں' اس وقت سے وہ انتہاپسندانہ طرز فکر عام ہوتا گیا جس میں سیاست کو "خلافت فی الارض" اور "حکومت الٰہیہ" وغیرہ کے عنوانات سے دین کا بنیادی مقصد قرار دے لیا گیا۔ طرز فکر کی اس غلطی نے مسلمانوں میں اتنی آہستگی سے اپنی جگہ بنائی کہ اچھے اچھے لوگوں کو یہ احساس نہ ہو سکا کہ ان کے فکر و عمل کا کانٹا تبدیل ہو گیا ہے۔ "سیاسی استقلال" کی ضرورت و اہمیت اس درجہ ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی کہ اس باریک مگر دور رس غلطی پر غور کر کے "دین میں سیاست" کا صحیح مقام متعین کرنے کی فرصت ہی نہ تھی' نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تصور بعض حضرات نے شعوری طور پر اختیار کیا اور بعض نے غیر شعوری طور پر' اور تحریکات کے اجتماعی عمل نے اس پر ایسی مہر ثبت کر دی کہ اچھے اچھے اہل علم کو بھی کانٹے کی اس تبدیلی کا احساس نہ ہو سکا۔

اس ماحول میں احقر کے علم کے مطابق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس باریک غلطی کو دو ٹوک لفظوں میں واضح فرمایا اور قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا کہ دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے؟ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

الذین إن مکنھم فی الأرض أقاموا الصلوۃ واٰتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف و نھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ الأمور۔

(ترجمہ) "وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں' اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

اس سے واضح ہے دیانات مقصود بالذات ہیں' اور

سیاسیات و جہاد مقصود اصلی نہیں' بلکہ اقامت دیانت کا وسیلہ ہے - یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاسیات و جہاد سب کو نہیں دیا گیا' بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی' دی گئی ورنہ نہیں۔ وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیات میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے' اور وہ یہ ہے:-

وعداللّٰہ الذین آمنوا و عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الأرض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم۔

(ترجمہ) "تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا"

یہاں ایمان و عمل صالح کو شرط قرار دیا جارہا ہے تمکین فی الارض کی' جس سے تمکین و سیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے' پس دین پر سیاست و

قوت موعود ہوئی لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، ورنہ آیت کریمہ :-

ولو أنهم أقاموا التوراة والإنجيل وما أنزل إليهم من ربهم لأكلوا من فوقهم ومن تحت أرجلهم

(ترجمہ) "اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے"۔

جس میں اقامت تورات و انجیل و قرآن، یعنی عمل بالقرآن پر وسعت رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے؟ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان و عمل صالح پر شوکت و قوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں جو بطور خاصیت اس پر مرتب ہوں گی نہ کہ مقصود جو اس کی غایت کہلائے۔

بہرحال! واضح ہوا کہ سیاست و دیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں اور دیانت خود مقصود اصلی ہے" (اشرف السوانح جلد ۴ (خاتمہ السوانح) ۲۸، ۲۹ طبع ملتان)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت نے ایک صفحے کی اس مختصر مگر انتہائی پر

مغز اور جامع تقریر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے موضوع کو اس قدر واضح فرمادیا ہے کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ وہ سیکولر نظریہ درست ہے کہ سیاست و حکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے' اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصلی مقصد سیاست و حکومت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے جس کا مظاہرہ عبادات و طاعات کے ذریعے ہوتا ہے۔ سیاست و حکومت بھی اسی مقصد کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے جو نہ بجائے خود مقصد ہے اور نہ اقامت دین کا مقصد اس پر موقوف ہے' بلکہ وہ حصول مقاصد کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں وہی سیاست و حکومت مطلوب ہے جو اس مقصد میں مدد و معاون ہو' اس کے برعکس جو سیاست اس مقصد کو پورا کرنے کے بجائے دین کے اصل مقاصد میں کنٹریبونٹ کرکے انہیں مجروح کرے' وہ اسلامی سیاست نہیں ہے' خواہ اس کا نام "اسلامی" رکھ دیا گیا ہو۔

(۲) اسلام کا نظام حکومت

قرون وسطیٰ میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومتیں عام طور سے رائج رہی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہتیں تھیں' جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر کوئی قانونی قدغن عائد نہیں ہوتی تھی' اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم و ستم اور ناانصافیوں کا بازار گرم رہا' اس لئے اس کے خلاف یورپ میں شدید رد عمل ہوا۔ "شخصی حکومت" کو بذات خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ "جمہوریت" کو ایک مثالی طرز حکومت کے طور پر پیش کیا گیا' یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہوگئیں' اور ان کی جگہ جمہوری نظام حکومت وجود میں آیا' بیشتر ملکوں میں جمہوریت قائم کی گئی' یہاں تک کہ جمہوریت کو ایک ایسا فیشن ایبل نظام حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کا ضامن ہے۔ چنانچہ گذشتہ (ہجری) صدی سے

لے کر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اٹھی ہیں، ان کے ذہن میں "جمہوریت" کی حیثیت معاذ اللہ ایک ایسے "کلمہ طیبہ" کی ہوگئی ہے جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر پہ چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہد حاضر میں جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لے کر اٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مسلم اصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ انہوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرفہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کیے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت احتیاط کی تو یہ کہہ دیا کہ جمہوریت کے جو اجزاء اسلام کے خلاف ہیں، ہم ان کے قائل نہیں ہیں، لہذا ہماری جمہوریت "اسلامی جمہوریت" ہے۔

یہ تصورات ہمارے دور میں اس قدر مشہور ہوگئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا یا کہنا دنیا بھر کی لعنت و ملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے، اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلمہ کفر کہنے کا مرتکب سمجھا جانے لگا ہے۔

لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خالص دین کی دعوت و تجدید کے لئے منتخب فرمایا ہو، وہ زمانے پر چھائے ہوئے تصورات اور خوشنما نعروں سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے متعدد مواعظ و ملفوظات اور تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تنقیدیں کی ہیں، اور اپنے دینی نقطۂ نظر سے اس کی خرابیوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العنان بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادی اظہار رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے ذریعے وہ بے مہار نہ ہو سکیں۔ اور چونکہ اسلام نے "مشاورت" کا حکم دیا ہے' اس لئے "جمہوریت" کو "مشاورت" کے ہم معنی سمجھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا جمہوریت عین اسلام ہے۔ حالانکہ بات اتنی سادہ نہیں ہے' در حقیقت "جمہوری نظام حکومت" کے پیچھے ایک مستقل فلسفہ ہے، جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا' اور جس کے لئے سیکولرزم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کی حقیقت واضح کرنے کے لئے یہ جملہ مشہور ہے کہ۔

It is the government of the people
by the people for the people

جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور
عوام کے فائدے کے لئے قائم ہوتی ہے۔

لہٰذا "جمہوریت" کا سب سے پہلا رکن اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے' اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرت رائے کی بنیاد پر ہوا ہو وہ واجب التعمیل اور ناقابل تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ کثرت رائے کے اس فیصلہ پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اگر دستور حکومت عوامی نمائندوں کے اختیار قانون سازی پر کوئی پابندی بھی عائد کردے۔ (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن و سنت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لئے واجب التعمیل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے' بلکہ صرف اس لئے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرت رائے نے عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر کثرت رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرت رائے کو (معاذ اللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بد تر قوانین کثرت رائے کے زور پر مسلسل نافذ کیے جاتے رہے ہیں' اور آج تک نافذ کیے جا رہے ہیں' زنا جیسی بد کاری سے لے کر ہم جنسی جیسے گھناونے عمل تک کو اسی بنیاد پر سند جواز عطا کی گئی ہے' اور اس طرز فکر نے دنیا کو اخلاقی تباہی کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کثرت رائے کے اس جمہوری فلسفے پر جابجا تبصرے فرما کر اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وإن تطع أكثر من في الأرض يضلوك عن سبيل الله.

(ترجمہ) "اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے"۔

کثرت رائے کو معیار حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن زمانے پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا کہ جس طرف کثرت رائے ہوگی' وہ بات ضرور حق ہوگی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اپنی تالیفات اور مواعظ و ملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے' ایک وعظ میں فرماتے ہیں:۔

> "آجکل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے' صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے' مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود

ﷺ نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا' ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود ﷺ ایک طرف۔ آخر کیوں انہوں نے توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لئے کہ وہ قوم بہت جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔

(فضائل العلم والخشیۃ ۳۰ و معارف حکیم الامت ۶۱۷)

مطلب یہ ہے کہ عوام کی کثرت رائے کبھی معیار حق نہیں ہو سکتی کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت ؒ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

"مولانا محمد حسین الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ' تو اس قاعدے کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہو گا"

(تقلیل الاختلاط مع الانام و معارف حکیم الامت ؒ ۶۲۶)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

(غزوہ احد) میں ان پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین تھے' اختلاف ہوا بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں' حضور ﷺ نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اس لئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور ﷺ کے مقصود کی مخالفت نہ ہو گی اور ہم نے اب تک

جنگ میں حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے، بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور ﷺ نے صاف فرمادیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لئے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے، مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے' یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی' اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔)

(ذم النسیان ص ۱۲' معارف حکیم الامت ص ۶۱۸)

اسی وعظ میں آگے چل کر حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے کثرت رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق اکبر ؓ کے اس طرز عمل کی مثال بھی دی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمر ؓ سمیت بیشتر صحابہ کرام ؓ کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے لیکن حضرت صدیق اکبر ؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی۔

حضرت حکیم الامت ؒ نے کثرت رائے کو معیار حق قرار دینے کے نظرئے پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے' اور سادہ سادہ لفظوں میں ایسے حقائق بیان فرمادیئے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے گا اسی نتیجے تک

پہنچے گا چنانچہ جدید علم سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی "جمہوریت" کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے۔ ایک مشہور ماہر سیاسیات ایڈمنڈ بورک (Burke) لکھتا ہے:

"اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کرنا کوئی فطرت کا قانون نہیں ہے کم تعداد بعض اوقات زیادہ مضبوط طاقت بھی ہو سکتی ہے اور اکثریت کی حرص و ہوس کے مقابلے میں اس کے اندر زیادہ معقولیت بھی ہو سکتی ہے لہذا یہ مقولہ کہ "اکثریت کے فیصلہ کو قانون بننا چاہئے" اس میں افادیت اور پالیسی کی بھی اتنی ہی کمی ہے، جتنی حقانیت کی"۔ (۱)

حکیم الامت قدس سرہ ایک اور وعظ میں فرماتے ہیں:

"اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی، پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھادیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے، تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی (۲)

بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت ؒ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے جنکا میدان علم سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دکھتی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی۔ ان کا اصل ماخذ قرآن و سنت تھے اور وحی کی اسی روشنی نے انہیں وہ نور فراست عطا فرمادیا تھا، جس کے ذریعے وہ ان مسائل

---

(1) Quoted by A.Appadorai,The Substance of Politecs,Oxford University Press 9th ed 1961 p.133

(۲) وعظ "الانسداد" ماخوذ از اصلاح المسلمین ص ۵۱۰ مطبوعہ ادارہ اسلامیات لاہور۔

کو انتہائی سادگی سے بیان فرما گئے ہیں، جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنا رکھا ہے چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فراست ایمانی کا نتیجہ تھا۔ علم سیاست بیشک آپ کا اصل میدان نہیں تھا' لیکن جو سچائی وحی کے نور سے معلوم ہوئی ہو' اسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن اس علم سیاست کے وہ ماہرین بھی جنہوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے وہ بھی بالاخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ اپادورائے برصغیر میں اپنی سیاسی تصانیف کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ وہ "جمہوریت" کے تعارف اور اس کی کامیابی کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> "جمہوریت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذ و نادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد (quantity) پر رہتی ہے۔ کیفیت (quality) پر نہیں۔
>
> اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں' انہیں تولا نہیں جاتا۔ شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی وظائف زندگی میں سے نہیں سمجھتی' چنانچہ اس کو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی' وہ کام کرتی اور کھیلتی رہتی ہے' اپنے پیشہ وارانہ اور فنی کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے' ہل چلاتی' بیج بوتی' فصلیں کاٹتی اور انہیں بیچتی رہتی ہے' اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے۔ جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی' جس کے ذریعہ وہ ان مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کر سکیں جو انتخابات کے موقع پر ان کے سامنے فیصلے کے لئے آتے ہیں' لہٰذا وہ طبقاتی

جذبات اور نعروں سے گمراہ ہوسکتے ہیں' سرہنری مین تو یہاں تک
کہتے ہیں کہ جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں
کر سکتی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آراء
کو تسلیم کرتے ہیں" (۱)

مغرب کے مشہور مؤرخ اور فلسفی کارلائل کا یہ اقتباس علم سیاست میں کافی
شہرت پاگیا ہے کہ:

> Surely, of all "rights of man " , this right of the ignorant man to be guided by the wiser, to be, gently or forcibly, held in the true course by him, is the indisputablste. Nature hereself ordains it from the first, society struggles towards perfection by enforcing and accmoplishing it more and more..... In Rome and Attens, as elsewhere if you look practical we shall find that it was not by loud voting and debating of many, but by wise inright and ordering of a few that the word war done. So is it ever, so will it ever be".

"انسانی حقوق" میں یقینی طور پر جاہل افراد کا یہ حق سب سے زیادہ

A.Appadorai,opcitp.133. (۱)

غیر متنازعہ ہے کہ عقل مند افراد کی رہنمائی کریں' اور انہیں نرمی
سے یا طاقت کے ذریعہ سیدھے راستے پر رکھیں۔ فطرت کا شروع
سے یہی حکم ہے' اسی حکم کو نافذ کر کے اور اس کی زیادہ سے زیادہ
تکمیل کر کے ہی سوسائٹی کمال تک پہنچنے کی جدوجہد کرتی ہے۔۔۔۔
۔۔اگر ہم عملی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ روم اور ایتھنز
میں دوسرے مقامات کی طرح بلند آواز سے رائے شماری کرنے
اور بہت سے لوگوں کے بحث مباحثہ کے ذریعے نہیں بلکہ گنے چنے
افراد سے کام چلتا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سے سچ رہی ہے۔ لہٰذا آئندہ بھی
یہی بات سچ رہے گی" (۱)

شخصی حکومت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جمہوریت پر تنقید فرماتے ہوئے کئی مقامات پر اس کے مقابلے میں "شخصی حکومت" کی حمایت فرمائی ہے۔ آج کے جمہوریت پرست دور میں شخصی حکومت کی حمایت کلمہ کفر کی طرح نشانہ ملامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بنیادی سبب دو ہیں: ایک یہ کہ جمہوریت کی حمایت میں پروپیگنڈا اس قدر زور شور کے ساتھ کیا گیا کہ کسی مخالف نظام حکومت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر ہی ذہن آمادہ نہیں ہوتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "شخصی حکومت" کا نام آتے ہی ذہن ان مطلق العنان بادشاہوں کی طرف چلا جاتا ہے جن کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور ان پر کوئی بالاتر پابندی عائد نہ تھی' یا پھر اس نام سے ان فاشی حکمرانوں کا تصور آجاتا ہے جن کے نزدیک حکومت کی بنیاد محض زور زبردستی پر تھی۔ حالانکہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ "شخصی حکومت" سے وہ "مثالی اسلامی

---

(۱) Chartism(1839)asquotedbyAppadorai,opcitp.128

حکمران" مراد لیتے ہیں جسے امیر المومنین یا خلیفہ وقت کہا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جو غیر اسلامی شخصی حکومتیں رائج رہی ہیں۔ ان کی خرابیوں اور مفاسد کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)..... ان "شخصی حکومتوں" کی بنیاد بادشاہتوں میں عموماً خاندانی وراثت پر تھی اور فاشزم کے فلسفے میں صرف "قوت" پر، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو قوی ہو، وہ کمزور پر حکومت کا حق لے کر آیا ہے۔ لہٰذا ان شخصی حکومتوں کے قیام میں سنجیدہ غور و فکر اور مناسب انتخاب کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا۔

(۲)..... ان شخصی حکمرانوں کے لئے کوئی ایسی لازمی صفات اہلیت ضروری نہیں تھیں جن کے بغیر وہ حکمرانی کے منصب تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔

(۳)..... یہ شخصی حکومتیں عموماً ایسے آسمانی قوانین کی پابند نہیں تھیں جو ان کے فیصلوں کو لگی بندھی حدود میں محدود رکھ سکیں۔ لہٰذا قانون ساز وہ خود تھے اور مطلق العنان ہونے کی بنا پر ان کی زبان قانون بن گئی تھی۔

(۴)..... ان حکومتوں میں کوئی ایسا لازمی ادارہ موجود نہیں تھا جو ان کے اقدامات، ان کے صادر کئے ہوئے احکام، اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کو کسی لگے بندھے معیار پر پرکھ سکتا اور ان کی طرف سے آسمانی قانون کی خلاف ورزی، اپنی حدود و اختیار سے تجاوز، یا کسی ظلم و ستم کی صورت میں ان کے اقدامات کی تلافی کر سکتا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر شخصی حکومتوں میں لوگوں کے حقوق پامال ہوئے اور انسان انسان کا غلام بن گیا۔ ورنہ اگر یہ خرابیاں موجود نہ ہوں تو بیشتر ماہرین سیاست اس بات پر متفق ہیں کہ شخصی حکومت میں بذات خود کوئی خرابی نہیں۔ وہ جمہوریت کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب اور عوام کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ روسو نے بھی یہ اعتراف کیا کہ:

"حکومت کا بہترین اور سب سے فطری انتظام یہ ہے کہ عقل

مند ترین انسان کو کثرت پر حکومت کرنی چاہئے بشرطیکہ اس بات
کی ضمانت مل جائے کہ وہ اس کثرت کے مفاد کے لئے حکومت
کریں گے' نہ کہ اپنے مفاد کے لئے"(۱)

کارلائل لکھتا ہے کہ:

"کسی بھی ملک میں وہاں کے قابل ترین آدمی کو دریافت کر لو' پھر
اسے اٹھاکر اطاعت کے اعلیٰ ترین مقام پر رکھ دو' اور اس کی
عزت کرو' اس طرح تم اس ملک کے لئے ایک مکمل حکومت
دریافت کر لو گے' پھر بیلٹ بکس ہے' یا پارلیمنٹ میں ہونے والی
فصاحت و بلاغت یا رائے شماری یا دستور سازی یا کسی بھی قسم کی
کوئی اور مشینری اس حکومت میں کوئی بہتر اضافہ نہیں کر سکے
گی۔ یہ ایک مکمل ریاست ہو گی اور وہ ملک ایک مثالی ملک ہو
گا"۔ (۲)

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ جس "شخصی حکومت" کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہے ہیں۔ وہ شخصی حکومت کی مذکورہ بالا خرابیوں سے خالی ہے۔ وہ اس معنی میں بے شک "شخصی حکومت" ہے کہ اس میں جمہوری انداز کی پارلیمنٹ مختار کل نہیں ہے' اور اختیارات حکومت بڑی حد تک "خلیفہ" یا "امیرالمومنین" کی ذات میں مرکوز ہیں' لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس "خلیفہ" یا "امیرالمومنین" کا تعین وراثت یا قوت کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اہل حل و عقد کے انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے اور اس انتخاب کے لئے "خلیفہ" میں کچھ معیاری اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔ جن کے بغیر اہل

---

(1) Roussian, The Social Contract, bk lll, ch. v. as quoted by Appadorai, op cit p. 127
(2) - G.N Sabine, A History of Political Theory p. 764 (Appadorai p. 122)

حل و عقد کے لئے کسی شخص کا انتخاب جائز نہیں۔ ان اوصاف میں علمی قابلیت کے علاوہ کردار کی اعلیٰ ترین پختگی اور رائے کی اصابت بھی داخل ہے۔ آج کل کی جمہوریتوں میں سربراہ کے انتخاب کے لئے عموماً نہ کوئی قابلیت شرط ہوتی ہے، نہ کردار و عمل کی کوئی خوبی۔ لیکن "خلیفہ" کے لئے اسلام میں نہایت کڑی شرائط تجویز فرمائی گئی ہیں اور اہل حل و عقد کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان شرائط کا مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد خلیفہ کا انتخاب کریں۔

پھر یہ خلیفہ بھی، جو اعلیٰ ترین علمی اور عملی اوصاف کا حامل ہے، مطلق العنان قانون ساز نہیں ہوتا، بلکہ قرآن و سنت اور اجماع امت کا پابند ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قانون وضع نہیں کرتی، بلکہ ایک ایسے آسمانی قانون کی بنیاد پر وجود میں آتی اور اسی کو نافذ کرتی ہے جو کائنات کی اعلیٰ ترین اتھارٹی کا بنایا ہوا ہے، اور قرآن و سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ ہاں قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے انتظامی قوانین اور احکام جاری کرنا حکومت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی اس پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے اقدامات کے لئے اہل شوریٰ سے مشورہ لے، اس مشورے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ لازمی طور پر کثرت رائے کی پابندی کرے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسئلے کے تمام پہلو سامنے آجائیں اور ان کو مد نظر رکھنے کے بعد وہ اپنی بہترین قابلیت اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر خود فیصلہ کرے۔

اس کے علاوہ سربراہ حکومت کا ہر اقدام، اس کا ہر حکم اور اس کا بنایا ہوا ہر قانون چونکہ قرآن و سنت کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت یہ سربراہ قرآن و سنت کے احکام سے تجاوز کرے یا عدل و انصاف کے خلاف کوئی کام کرے تو قاضی کی عدالت سے اس کے خلاف چارہ کار حاصل کرنا ہر ادنیٰ شہری کا ناقابل تنسیخ حق ہوتا ہے۔

اس نظام حکومت کی تمام تفصیلات کو بیان کرنا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے، لیکن یہاں بتلانا صرف یہ تھا کہ حکیم الامت قدس سرہ نے اسلام میں جس "شخصی

حکومت" کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس میں قدیم بادشاہتوں اور جدید فاشی حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں کی خرابی کے بنیادی اسباب موجود نہیں ہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے جمہوریت اور شخصی حکومت پر اپنے متعدد مواعظ اور ملفوظات میں تبصرہ فرمایا ہے۔ جن میں سے غالباً سب سے جامع اور مفصل بحث اس وعظ میں فرمائی ہے جو "تقلیل الاختلاط مع الانام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے چند مختصر اقتباسات ذیل میں پیش خدمت ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں، وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں، مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی، فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے، حقیقی نہیں، تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں، مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے، کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے، وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے، اگر ایسا بھی ہوتا، جب بھی کسی قدر آدمی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں۔ بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں، اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے، جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی ہے جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا، کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا، نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں

کا" اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا' ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے' تم نے دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا؟ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو' وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو' یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اسے بھی انکار نہیں' مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو' اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو"۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں:

"نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں' بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں آکر ان کو اپنے دعوئ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعوئ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے۔ وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں' اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانے میں دو نبی تھے ۔ جو بنی اسرائیل اور قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے' مگر دونوں برابر درجہ میں نہ تھے' اور یہ تابعیت

محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے"۔

مزید ارشاد فرماتے ہیں:-

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں، اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں، شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو، اس لیے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیے، بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا، ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں، کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا، ایک نے ریل کو ایجاد کیا، تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا

ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہو گا؟ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا ہے بادشاہ اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کر سکتا' بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں ' سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر' اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے' اس لئے یہ قاعدہ کلی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک شخص ہی کی رائے ہو۔

مزید آگے ارشاد فرماتے ہیں:-

"دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں' وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے' وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے' تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو' ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنا دیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی

سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد! اے جماعت عقلاء! بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شائد اسی کی رائے صحیح ہو' اور جس کی رائے میں اتنی درایت نہ ہو' اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناو۔ اب بتلاو کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلے میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

بس ہم شخصی سلطنت کے اس لیے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زریں العقل' صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لیے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو' تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جس کے لیے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو' بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناو جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو' مستقل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے' صائب العقل' زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا' اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت

پیش کرتے ہیں کہ "و شاورھم فی الامر" مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا' اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت بریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرۃ! تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریرۃ" پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص جن کا نام مغیث تھا' ان کے آقا نے کر دیا تھا جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دے دیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا۔ اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں' اگر چاہیں فسخ کر دیں' اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرۃ" نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی' وہ صدمہ فراق میں مدینہ کے گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے' حضور ﷺ کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریرۃ" سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اے بریرۃ! کیا اچھا ہو کہ اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو تو وہ دریافت فرماتی ہیں۔ یارسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے؟ یا مشورہ کی ایک فرد ہے؟ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے۔ گو مجھ کو تکلیف ہی ہو' آپ ﷺ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے' حضرت بریرۃ" نے صاف عرض کر دیا اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔ لیجئے! اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ

کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ حضرت بریرۃؓ نے جب حضور ﷺ کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور ﷺ ان سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے اور نہ حضرت بریرۃؓ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا۔ سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دیں اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔

پس "شاورھم فی الامر" سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے اور جب تک ثابت نہ ہو اس وقت تک "شاورھم فی الامر" سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو؟ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حضرت بریرۃؓ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورے پر عمل کرنا ضروری نہیں، خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے ہرگز مجبور نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف کیوں نہ

ہو چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے: "فاذا عزمت فتوکل علی اللہ" کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں، یہاں "اذا عزمت" صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو "اذا عزمت" نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے "اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ" فرماتے، پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں، اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ "**حفظت شیئا و غابت عنک أشیاء**" کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ نچناچہ شریعت میں "**أشیروا الحکام و ھو حقکم علیھم**" کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں اور پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے"۔

(تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۴۸، و اشرف الجواب ص ۳۰۹ تا ۳۱۰ مطبوعہ ملتان و معارف حکیم الامت ص ۶۲۰ تا ۶۳۰)

حکمرانی ایک ذمہ داری ہے نہ کہ حق

پھر غیر اسلامی شخصی حکومتوں میں اور اسلام کی شخصی حکومت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غیر اسلامی معاشروں میں "شخصی حکومت" ایک "حق" (Prinilege) یا ایک فائدہ (Advantage) سمجھ لیا گیا ہے اسی لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق کس کو ملے؟ اور کس کو نہ ملے؟ اور اسی لیے لوگ از خود اس کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اس کے برعکس اسلام میں یہ ایک "امانت" یا ایک "ذمہ داری" ہے جو حکمران کے لیے اسباب عیش فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ کندھے پر دنیا و آخرت کا ایک زبردست بوجھ سوار کرنے کے مترادف ہے لہٰذا یہ از خود کوشش کر کے حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس سے انسان اپنی استطاعت کی حد تک جتنا بھاگ سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ اسلام میں اس شخص کو "حکومت" کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے جو خود اس کا طلب گار ہو چناچہ اسلامی سیاست میں "امیدواری" (Candidature) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

حکومت کے فرائض

لہٰذا جس شخص کو بھی یہ ذمہ داری سونپی جائے اسے اس نقطہ نظر کے ساتھ اسے سنبھالنا ہے کہ "حکومت" بذات خود مقصود نہیں جس سے ہر حال میں چمٹے رہنا ضروری ہو' بلکہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے' لہٰذا اگر کبھی حکومت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں تعارض ہو گا تو وہ بلاتامل اپنی حکومت کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کروں گا' اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت ایک وعظ میں فرماتے ہیں:-

> "یاد رکھو! سلطنت مقصود بالذات نہیں' بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں' اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم

فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو
فرعون' ہامان' نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں' حالاں کہ
وہ مردود ہیں۔ معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں
رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضائے حق
نہ ہو' وہ وبال جان ہے اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ
اٹھانے پر راضی ہیں' اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں آخر
حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان
کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑی؟ محض اس لیے کہ
مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا؟ معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود
نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع
ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے' حضرت
ابراہیم بن ادہم ہر فن کے امام ہیں' حدیث میں ثقہ اور محدث
ہیں' اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیاء میں تو امام ہیں' ان کو کوئی
پاگل نہیں کہہ سکتا' جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے پھر دیکھو تو
انہوں نے کیا کیا؟ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو
بادشاہت پر لات مار کر الگ ہو گئے ۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی
اللہ تعالیٰ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی' تو ان کو اجازت دی
گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے
لیے مضر مقصود تھی تو ان کے لیے حکم ہے **لا تلین مال یتیم
ولا تقضین بین اثنین** ۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق
ہے اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا"
(تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۶۰ تا ص ۶۳' اشرف الجواب ص ۳۵۵ و ۳۵۶)

لہٰذا اسلامی حکمران کا فریضہ ہے کہ وہ حکومت کو رضائے الٰہی کا وسیلہ بنانے کیلئے اسلامی احکام پر عمل اور ان کے نفاذ کے لیے اپنی جان توڑ کوشش صرف کرے، ورنہ اس کی حکومت بیکار محض اور اس کا حکومت سے چمٹا رہنا ناجائز و حرام ہے لہٰذا اس کا یہ فرض ہے کہ انتہائی جزرسی کے ساتھ اپنے اقدامات کا جائزہ لیتا رہے اور شریعت کے معاملے میں ادنیٰ غفلت کو گوارا نہ کرے۔ حضرت ﷺ فرماتے ہیں:۔

"سلطنتیں جو گئی ہیں، میرے نزدیک چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہیں کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہو جاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور اثر زوال کا موجب ہوتا ہے نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے اور وہ براہ راست مخل ہیں سلطنت کی"

(اصلاح المسلمین ص ۵۳ بحوالہ الافاضات ص ۷ ملفوظ ۲۵۹)

مسلمان حاکم کا فرض جس طرح یہ ہے کہ وہ خود انصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرے اسی طرح اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو بھی ظلم نہ کرنے دے، حضرت ﷺ فرماتے ہیں:۔

"حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمے ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دے دے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں اس لیے اگر میرے عملے میں بھی کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز نہ دے، بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے، پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو، اس

سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے..... نیز حکام کو یہ بھی چاہئے کہ لوگوں کے تعلقات براہ راست اپنے سے رکھیں، کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں۔ اگر کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے، تو حضرت! حکومت کرنا آسان نہیں، یہ منہ کا نوالہ نہیں ہر وقت جہنم کے کنارے پر ہے۔"

(انفاس عیسیٰ ص ۲۲۴، ۲۲۵ جلد ۲، باب ۴)

اسلامی حکومت میں حکمران اور علماء کے درمیان تقسیم کار کیا ہونے چاہیے؟ اس کے بارے میں حضرت ؒ فرماتے ہیں:

حضور ﷺ میں دو شانیں تھیں، شان نبوت اور شان سلطنت، اس کے بعد خلفائے راشدین ؓ بھی دونوں کے جامع تھے، مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہوں پر تقسیم ہو گئیں، شان نبوت کے مظہر علماء ہیں اور شان سلطنت کے مظہر سلاطین اسلام، اب اگر یہ سلاطین، علماء سے استغناء کرتے ہیں تو حضور ﷺ کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں تو اس سے بھی حضور ﷺ ہی کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اب صورت دونوں کے جمع کرنے کی یہ ہے کہ سلاطین سے تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنی حدود میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک علماء حق سے استفتاء نہ کر لیں، اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کلر بند ہوں، اگر یہ دونوں شانیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہیں اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی صورت

نکل آئے' اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل پر جا لگے' ورنہ اللہ
ہی حافظ ہے۔"

(اصلاح المسلمین ص ۵۳۶)

مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکمران کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ عقلمند اور تجربہ کار لوگوں سے مشورہ لیتا رہے' لیکن مشورے کے بعد جب کسی جانب رجحان ہو جائے اور اللہ کے بھروسے پر اس کے مطابق فیصلہ کر دے تو تمام لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے' خواہ ان کی رائے کے خلاف ہو۔ حضرت ؒ فرماتے ہیں:-

"سلطان کو چاہیے کہ ہمیشہ عقلاء سے رائے لیتا رہے' بدون رائے لیے بہت سی باتیں نظر سے غائب رہتی ہیں' اور یہ مشورہ اور رائے تو مطلوب ہے' مگر یہ مخترعہ متعارفہ جمہوریت محض گھڑا ہوا ڈھکوسلہ ہے' بالخصوص ایسی جمہوری سلطنت جو مسلم اور کافر ارکان سے مرکب ہو وہ تو غیر مسلم ہی سلطنت ہوگی' ایسی سلطنت اسلامی نہ کہلائے گی"۔

اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر سلطان کے مشورہ لینے کے وقت اہل شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ سلطان کی رائے سے اختلاف کرنا مذموم تو نہیں' اس پر فرمایا کہ:-

"جو اختلاف حکمت اور مصلحت اور تدین و خیر خواہی پر مبنی ہو وہ مذموم نہیں' مگر اس کی بھی ایک حد ہے' یعنی یہ اختلاف اسی وقت تک جائز ہے جب تک مشورہ کا درجہ رہے' مگر بعد نفاذ اختلاف کرنا یا خلاف کرنا مذموم ہے' نفاذ کے بعد تو اطاعت ہی واجب ہے"

(الافاضات الیومیہ ص ۱۱۲' ۱۱۱ جلد ۳ ملفوظ ۲۵۲)

یہ در حقیقت اس آیت قرآنی کی توضیح ہے جس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ : "و شاورھم فی الامر و اذا عزمت فتوکل علی اللہ"۔ (ترجمہ) "اور ان سے معاملے میں مشورہ کرو' اور جب کوئی عزم کر لو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو"

(۳) اقامت دین کے لئے سیاسی جدوجہد کا شرعی مقام اور اس کی حدود

تیسرا موضوع جس پر اس مقالے میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ارشادات پیش کرنے مقصود ہیں' یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایک صحیح اسلامی حکومت کے قیام اور غیر اسلامی طاقتوں کے شر سے دفاع کے لئے جدوجہد کریں؟ اگر ضروری ہے تو اس جدوجہد کی حدود کیا ہونی چاہیں؟ اس موضوع پر حضرت قدس سرہ نے ایک مستقل رسالہ "الروضۃ الناضرۃ فی المسائل الحاضرۃ" کے نام سے تحریر فرمایا ہے جس میں اصولی طور پر سیاسی جدوجہد کی شرعی حیثیت کو بھی واضح فرمایا ہے' اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے۔ یہ رسالہ مختصر مگر بہت پر مغز اور جامع ہے۔ لیکن چونکہ اہل علم کے لئے لکھا گیا ہے' اس لئے اس میں علمی اور اصطلاحی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت ؒ فرماتے ہیں:

> "مدافعت کفار کی مطلقاً اہل اسلام سے' اور خصوص سلطنت اسلامیہ سے جس میں خلافت و غیر خلافت' اور جس میں سلطنت اسلامیہ واقعیہ و سلطنت اسلامیہ مزعومہ کفار سب داخل ہیں' پھر خصوص شعائر اسلام سے جن میں مقامات مقدسہ' بالخصوص حرمین شریفین بھی داخل ہیں' سب مسلمانوں پر فرض ہے' کبھی علی العین' کبھی علی الکفایہ علی اختلاف الاحوال' مگر اس کی

فرضیت کے کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں' منجملہ ان کے ایک شرط استطاعت بھی ہے' اور استطاعت سے مراد استطاعت لغویہ نہیں' استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے "**عن أبی سعید الخدری عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم قال من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فإن لم یستطع فبلسانہ**" (الحدیث رواہ مسلم' مشکوۃ باب الامر بالمعروف) ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہر وقت حاصل ہے' پھر اس کے انتفاء کی تقدیر کب متحقق ہو گی؟ اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت **بظن** غالب عادتاً ناممکن ہو۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں' مثلاً کفار کی جگہ کفار ہی مسلط ہوں یا مرکب کافر و مسلم سے کہ مجموعہ تابع اخس کے ہوتا ہے' کیونکہ اس صورت میں غایت ہی مفقود ہے' اور وہ اخلاء الارض من الفساد ہے' اور قاعدہ ہے--- **الشئی إذا خلا عن الغایۃ انتفٰی۔**

اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر وجوب تو ساقط ہو جائے گا 'باقی جواز' اس میں تفصیل ہے' بعض صورتوں میں جواز بھی نہیں' بعض میں جواز بلکہ استحباب بھی ہے۔ اور مدار بناء جواز و عدم جواز یا استحباب کا اجتہاد اور رائے پر ہے۔ پس اس میں دو اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایک عملی کہ واقعات سے ایک شخص کے نزدیک عدم جواز کی بناء متحقق ہے اور دوسرے کے نزدیک

جوازیا استحباب کی' دوسرا عملی کہ باوجود بناء جوازیا استحباب پر متفق ہونے کے ایک نے بناء بر عدم وجوب رخصت پر عمل کیا' دوسرے نے بناء بر استحباب عزیمت پر عمل کیا۔ ایک کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ اور اگر کسی مقام پر تسلط مسلمان ہی کا ہو مگر وہ مسلمان کافر سے مسالمت رکھتا ہو تو اس کو تسلط کافر کہنا محل تامل ہے۔"

(افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص۱۰)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو اور کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ جدوجہد واجب ہے' کبھی علی العین اور کبھی علی الکفایہ' لیکن اگر کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ ہو یا استطاعت نہ ہو تو واجب نہیں' لیکن مختلف حالات میں جائز یا مستحب ہو سکتی ہے' اور اس کے تعین میں اہل علم کی آراء بھی مختلف ہو سکتی ہیں' اور یہ اختلاف آراء اگر اخلاص کے ساتھ ہو تو نہ مذموم ہے نہ اس میں کسی کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق ہے۔

لیکن چونکہ دین کا مقصود اصلی سیاست نہیں' بلکہ دیانات اور ان کے ذریعے رضائے حق کا حصول ہے جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے الفاظ میں اس کی تفصیل عرض کی جاچکی ہے۔ اس لیے ہر قسم کی سیاسی جدوجہد شرعی احکام کے دائرے میں رہ کر ہونی چاہیے۔ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے دین کے کسی معمولی سے معمولی حکم یا تقاضے کو بھی قربان کرنا جائز نہیں ہے' اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب جدوجہد کرنے والا پورے اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ صرف دین حق کی سربلندی اور باری تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے جدوجہد کر رہا ہو اور محض جاہ و جلال کا حصول اس کا مطمع نظر نہ ہو' اور وہ شدید نفسانی تقاضوں کے باوجود اپنے آپ کو شریعت کے تابع رکھنے پر قادر ہو' ورنہ سیاست ایسا خارزار ہے جس میں قدم قدم پر نام و نمود اور جاہ و جلال کے

فتنے پیدا ہوتے ہیں' نفس و شیطان کی تاویلات انسان پر یلغار کرتی ہیں' اور بسا اوقات وہ ان تمام محرکات سے مغلوب ہو کر اسی راستے پر چل پڑتا ہے جس پر دنیا جا رہی ہے' اور رفتہ رفتہ اس کی سیاست اسلامی سیاست کے بجائے لادینی سیاست ہو کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی جدوجہد اور تزکیۂ اخلاق :

لہٰذا اس جدوجہد کی شرط اول یہ ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق کا تزکیہ ہو چکا ہو۔ اور اس کے جذبات و خیالات اعتدال کے سانچے میں ڈھل چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تیئیس سالہ عہد نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گذرے ہیں کہ نہ ان میں کوئی جہاد ہے نہ حکومت و ریاست ہے' نہ کسی قسم کی سیاسی جدوجہد ہے کوئی اگر مارتا اور اذیتیں دیتا ہے تو اس کے جواب میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں اور اس کے بجائے مسلسل صبر کی تعلیم و تلقین کی جا رہی ہے۔ یہ تیرہ سال تعلیم و تربیت اور تزکیہ اخلاق کے سال ہیں' مجاہدات نفس کی اسی بھٹی سے گزرنے کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق و اعمال صیقل ہو چکے تو اس کے بعد مدنی زندگی میں حکومت و سیاست اور جہاد و قتال کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> "دیکھئے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی' مدینہ میں پہنچ کر اجازت ہوئی اس کی کیا وجہ ہے' ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت و قلت اسباب اس کا سبب تھا یہ خلاف تحقیق ہے' کیونکہ مدینہ ہی میں پہنچ کر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی تمام جماعت تمام عرب کے مقابلے میں کیا چیز تھی؟ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلے میں یہ

اجازت ہوئی تھی' تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی؟------------نصوص سے خود معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلے میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا---------- اور یہ صورت ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی اور وجہ بتلانی چاہیے۔ اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ' اخلاص و صبر و تقویٰ کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے اس وقت اگر اجازت قتال کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جوش غضب اور انتقام للنفس کے لئے ہوتا' محض اخلاق اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ ہوتا' اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کی جاوے۔ اور حمایت الٰہی ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں (**بلیٰ إن تصبروا و تتقوا**) کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الٰہی اسی وقت متوجہ ہوتی ہے جبکہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راسخ ہوں (اور تقویٰ کے معنی ہیں: **احتراز عما نہی اللّٰہ عنہ' امتثال ما أمر بہ** جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء و عن شائبہ النفس بھی داخل ہے) اور مدینہ میں پہنچ کر یہ اخلاق راسخ ہو گئے تھے۔ مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذاء پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل

ہوگئی تھی۔

پھر ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن' اہل و عیال اور مال و دولت سب پر خاک ڈال دی تو ان کی محبت الٰہی کامل ہوگئی' اور محبت دنیا ان کے قلب سے نکل گئی۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ان کے قلوب بھی محبت الٰہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک ہوگئے تھے چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک کرنا چاہا۔---------

غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہوگیا جس میں وہ کامل اترے۔ اس کے بعد ان کو اجازت قتال دی گئی کہ اب جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے۔ جوش غضب اور خواہش انتقام اور شفاء غیظ نفس کے لئے کچھ نہ کریں گے اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ حمایت الٰہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے' حتیٰ کہ مثنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی ﷺ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا۔ مرتاکیانہ کرتا۔ اس کم بخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوکا۔ اب چاہیے تھا کہ حضرت علی ﷺ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے' مگر تھوکنے کے بعد فوراً اس کے سینے پر سے کھڑے ہوگئے۔ اور فوراً اسے چھوڑ دیا۔ وہ یہودی بڑا متعجب ہوا------ اور حضرت

علی ﷺ سے اس کی وجہ پوچھی کہ اگر آپ نے مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو تھوکنے پر کیوں رہا کر دیا؟----- حضرت علی ﷺ نے فرمایا کہ ------ بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا۔ اور جب تو نے مجھ پر تھوکا تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہو گا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہو گی۔ اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کروں' اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ وہ یہودی فوراً مسلمان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کرو بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کرو۔ دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے۔

اب ہماری یہ حالت ہے کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے ہیں۔ اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ احکام الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے' بس ان کا مقصود یہ ہے کہ کام ہونا چاہیے خواہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف' چندہ میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں' صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں' پھر حمایت الٰہی ان کے ساتھ کیوں کر ہو؟ بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ میاں مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو اس وقت تو کام کرنا چاہیے۔ بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جائیں

گے۔ (اناللہ و انا الیہ راجعون) ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے' نہ اخروی' اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے' جس کا یہاں صفر ہے''۔

(وعظ محاسن اسلام در مجموعہ ''محاسن اسلام'' ص ۲۸۰ مطبوعہ ملتان)

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات سے الگ رہے' اس دوران ایک صاحب نے یہ پیش کش کی کہ ہم آپ کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ آپ ہماری قیادت فرمایئے حضرت نے اس پیشکش کا مناسب جواب دینے کے بعد فرمایا:

''سب سے پہلے جو امیر المومنین ہو کر حکم دوں گا وہ یہ ہو گا کہ دس برس تک سب تحریک اور شور و غل بند۔ ان دس سالوں میں مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ جب یہ قابل اطمینان ہو جائیں گے تب مناسب حکم دوں گا''

(الافاضات الیومیہ ص ۶۷ ج ۳ ملفوظات ۸۹ ملقب بہ تدبیر افلاح)

اگر ہم حقیقت پسندی سے اپنے حالات کا جائزہ لیں تو محسوس ہو گا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس اقتباس میں ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے' اگر آج ہماری سیاست کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم مکی زندگی کے تیرہ سال کی چھلانگ لگا کر پہلے ہی دن سے مدنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تیار کئے بغیر اصلاح قوم کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ جھنڈا کس طرح پکڑا جاتا ہے؟ نہ ہمیں یہ پتہ ہے کہ اسے سر بلند رکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ نہ ہم نے اس کام کی کوئی تربیت حاصل کی ہے' بس ہم نے کچھ دوسری قوموں کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جھنڈا اٹھائے دیکھا تو انہی کی نقالی

ہم نے بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی جدوجہد کا طرز و انداز 'ہماری کوششوں کا طریق کار' ہماری اختیار کی ہوئی تدبیریں 'تقریباً سب کی سب وہ ہیں جو ہم نے دوسری قوموں سے مستعار لی ہیں 'اور ان کو شریعت کی کسوٹی پر صحیح طریقے سے پرکھے بغیر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جب ان طریقوں سے لادینی سیاست کامیاب ہو سکتی ہے تو اسلامی سیاست بھی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ حالانکہ اسلامی سیاست کو لادینی سیاست پر قیاس کرنا کھجور کے درخت کو کنویں پر قیاس کرنے کے مترادف ہے۔

سیاسی تدابیر

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی تصانیف اور مواعظ و ملفوظات میں جا بجا اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی سیاست میں صرف مقصد کا نیک اور شریعت کے موافق ہونا کافی نہیں 'بلکہ اس کے طریق کار اور اس کی تدبیروں کا بھی شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے 'اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ شریعت کے احکام پس پشت ڈال کر اور ان کی خلاف ورزی کر کے اسلامی حکومت قائم کرے گا تو وہ ایسی خام خیالی میں مبتلا ہے جس کا نتیجہ محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس طرح کوئی حکومت اس نے قائم کر بھی لی تو وہ اسلامی حکومت نہیں 'بلکہ اسلامی حکومت کا دھوکہ ہو گا۔

جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حضرت حکیم الامت کا ارشاد ناقابل انکار دلائل کے ساتھ گذر چکا ہے۔ اسلام میں سیاست و حکومت بذات خود مقصود نہیں 'بلکہ اصل شریعت کی اتباع اور اس کے نتیجے میں رضائے حق کا حصول ہے 'اس لئے یہ طرز فکر اسلام کے دائرے میں نہیں کھپ سکتا کہ اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں اسلام کے بعض احکام کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے 'اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے جزوی شرعی احکام کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ اس کے بجائے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے

دائرے میں رہ کر جدوجہد کرے' اور ہر اس طریقے سے اپنا دامن بچائے جس سے کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ مسلمان کی کامیابی کا راز اتباع شریعت میں ہے اسی پر نصرت الٰہی کا وعدہ ہے لہٰذا کامیابی انشاء اللہ اسی طریقے سے ہوگی۔ اور اگر بالفرض کسی شرعی حکم کی پابندی کی وجہ سے ظاہراً کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکے تب بھی مسلمان اس سے زیادہ کا مکلف نہیں نہ اس ناکامی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور نہ اس سے آخرت میں اس ناکامی پر بازپرس ہوگی۔ اگر وہ شریعت کے فرمان پر چل رہا ہے تو وہ پوری طرح کامیاب اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر کا مستحق ہے اور اس کی زندگی کا اصل مقصد پوری طرح حاصل ہے۔ لہٰذا سیاسی جدوجہد کے دوران ہر تدبیر اور ہر اقدام کے بارے میں یہ اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ وہ شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز ہے؟ کسی تدبیر کو اختیار کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اس تدبیر کا موجودہ سیاست کی دنیا میں رواج عام ہے یا وہ سیاسی تحریکوں میں بہت موثر ثابت ہوئی ہے' اور اسے آج کی سیاست میں ناگزیر سمجھا جاتا ہے اگر وہ اصول شرعیہ کے اعتبار سے جائز نہ ہو' یا شرعی مفاسد پر مشتمل ہو تو خواہ موجودہ سیاست کے علمبردار اسے کتنا ضروری کیوں نہ سمجھتے ہوں' اسے ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ سیاست مقصود نہیں' شریعت کی اطاعت مقصود ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرام ؓ کے حالات میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں آپ ﷺ نے یا آپ ﷺ کے پاکباز صحابہ ؓ نے موثر سے موثر تدبیریں صرف اس لئے چھوڑ دیں کہ وہ شریعت کے خلاف تھیں۔

غزوۂ بدر کے موقع پر جب حق و باطل کا پہلا فیصلہ کن معرکہ درپیش تھا۔ اور تین سو تیرہ بے سروسامان صحابہ کرام ؓ اتنی بڑی طاقت سے ٹکر لینے جا رہے تھے تو ایک ایک شخص کی بڑی قدر و قیمت تھی' اور قدرتی طور پر نفری میں تھوڑا سا بھی اضافہ کامیابی میں موثر ہو سکتا تھا' اس موقع پر حضرت حذیفہ ابن یمان ﷺ جیسے جاں نثار صحابی اور ان کے والد نے لشکر میں شامل ہونا چاہا لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں اس بناء پر جہاد میں شامل

ہونے سے روک دیا کہ آتے وقت انہیں کفار نے گرفتار کر لیا تھا اور اس وعدے پر چھوڑا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی مدد نہیں کریں گے۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں جہاد کی شرکت سے روکتے ہوئے فرمایا۔

نفی بعهدو نستعین اللّٰہ تعالیٰ علیهم

ترجمہ:۔"ہم ان سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں گے۔"

(صحیح مسلم و بخاری ص ۱۰۶ ج ۲ سیر اعلام النبلاء ص ۳۲ و ۳۳ ج ۲ و الاصابہ ص ۲۲۳ ج ۲)

اسی غزوہ میں ایک نہایت تجربہ کار مشرک شخص نے جو اپنی بہادری اور جنگجوئی میں مشہور تھا۔ آپ ؐ کے ساتھ لڑائی میں شامل ہونا چاہا لیکن یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا اور اس پہلے معرکے میں کسی کافر کی مدد لینا اسلام کو گوارا نہ تھا۔ چنانچہ اس وقت حکم یہی تھا کہ کافروں سے مدد نہ لی جائے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے اسے بھی لڑائی میں شامل کرنے سے انکار فرمادیا اور ارشاد فرمایا :۔

ارجع 'فلن أستعین بمشرک

ترجمہ:۔"میں کسی مشرک سے ہرگز مدد نہ لوں گا۔"

(جامع ترمذی کتاب السیاب فی اہل الذمۃ یغزون مع المسلمین۔)

خلفائے راشدین ؓ کا مقام تو بہت بلند ہے۔ بعد کے صحابہ کرام ؓ بھی اسی اصول پر ہمیشہ کار بند رہے۔ حضرت معاویہ ؓ کا رومیوں سے جنگ بندی کا معاہدہ تھا اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے حضرت معاویہ ؓ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور مدت کے ختم ہوتے ہی حملہ کر دیا' رومی لوگ بے خبری میں تھے اس لئے پسپا ہونے شروع ہو گئے اور حضرت معاویہ ؓ فاتحانہ آگے بڑھتے رہے اتنے میں حضرت عمرو بن عبسہ ؓ پیچھے سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے اور حضرت معاویہ ؓ کو روک کر انہیں ایک حدیث سنائی جس کی رو سے یہ حملہ شرعاً ناجائز تھا۔ حضرت معاویہ ؓ یہ سمجھتے تھے کہ حملہ

چونکہ جنگ بندی ختم ہونے کے بعد ہوا ہے اس لئے یہ عہد شکنی میں داخل نہیں ہے۔ لیکن حدیث سنتے ہی کوئی تاویل کرنے کے بجائے اپنے پورے لشکر کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔

(جامع ترمذی' ابواب السیاب ماجاء فی الغدر)

جو سالار لشکر اپنی کامیاب تدبیر کے بعد فتح کے نشے میں آگے بڑھ رہا ہو' اس کے لئے اپنی یلغار روکنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ مفتوحہ علاق بھی واپس کر دے۔ لیکن مقصد چونکہ سیاست و حکومت نہیں' اطاعت شریعت تھا۔ اس لئے تدبیر کے ناجائز ہونے کا علم ہوتے ہی اس ساری تدبیر سے دستبردار ہو گئے۔

غرض ہماری تاریخ ایسی درخشاں مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں مسلمانوں نے موثر تدبیر کے لئے بھی شریعت کی ادنیٰ خلاف ورزی گوارا نہیں کی بلکہ اسے ترک کر دیا۔

لہٰذا اسلامی سیاست میں جدوجہد کی تدبیروں کا شرعاً جائز ہونا ضروری ہے لیکن آج کل عموماً سیاسی جدوجہد کے دوران یہ پہلو نظروں سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے' جو تدبیریں لادینی سیاست کے علمبردار اختیار کئے ہوئے ہیں اور جن کا رواج عام ہو چکا ہے انہیں یہ دیکھے بغیر اختیار کر لیا جاتا ہے کہ تدبیریں اپنے لوازم کے ساتھ جائز بھی ہیں یا نہیں؟ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے سیاسی جدوجہد کے کئی مروجہ طریقوں پر شرعی نقطۂ نظر سے بحث فرمائی ہے اور ان کے شرعی حکم کو واضح فرمایا ہے۔

بائیکاٹ اور ہڑتال کا شرعی حکم

مثلاً حکومت سے مطالبات منوانے کے لئے آج کل ہڑتالوں کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے' اگر بات صرف اس حد تک ہوتی کہ لوگ اپنی خوشی سے احتجاجاً کاروبار بند کر دیں تو دوسرے مفاسد کی عدم موجودگی میں اسے ایک مباح تدبیر کہا جا سکتا تھا' چنانچہ حضرت

فرماتے ہیں:-

"بائیکاٹ یا نان کو آپریشن 'یہ شرعاً افراد جہاد میں سے نہیں 'دلائل میں ملاحظہ کیا جائے' بلکہ مستقل تدابیر مقاومت کی ہیں جو فی نفسہ مباح ہیں۔

(الروضۃ الناضرۃ 'افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۲۰)

لیکن ایسی ہڑتال جو لوگوں نے کلیتاً "اپنی خوشی سے کی ہو آج عملاً دنیا میں اس کا وجود نہیں ہے 'اکثرو بیشتر تو لوگوں کو ان کی خواہش اور رائے کے بر خلاف ہڑتال میں حصہ لینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی حصہ نہ لے تو اس کو جسمانی اور مالی اذیتیں دی جاتی ہیں 'سنگ باری اور آتشزنی تو ہڑتال کا ایک لازمی حصہ بن گئے ہیں 'سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے لوگوں کے لئے اپنی ضرورت سے چلنا پھرنا مسدود کر دیا جاتا ہے 'چلتی ہوئی گاڑیوں پر پتھراؤ ہوتا ہے 'بہت سے لوگ اسی قسم کی ایذاء رسانیوں کے خوف سے اپنا کاروبار بند رکھتے ہیں اور جو ضرورت مند شخص باہر نکلنے پر کسی وجہ سے مجبور ہو وہ ہروقت جانی و مالی نقصان کے خطرے میں رہتا ہے اور بسا اوقات کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا جاتا ہے 'بعض مرتبہ مریض علاج کو ترس ترس کر رخصت ہو جاتے ہیں اور بہت سے غریب لوگ فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام باتیں ہڑتال کا ایسا لازمی حصہ بن کر رہ گئی ہیں کہ ان کے بغیر کسی "کامیاب ہڑتال" کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں شرعاً حرام و ناجائز ہیں اور جو چیز ان حرام و ناجائز باتوں کا لازمی سبب بنے وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

لہذا حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ہڑتال کے مروجہ طریقوں کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے 'تحریکات خلافت کے زمانے میں "ترک موالات" کے جو طریقے اختیار کئے گئے تھے ان میں ہڑتال بھی داخل تھی 'ترک موالات کے تحت یہ تحریک چلائی گئی تھی کہ برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے 'چنانچہ اہل تحریک نے ایسی دوکانوں پر جو برطانوی

مصنوعات فروخت کرتی تھیں رضا کار مقرر کر دیئے تھے' جو لوگوں کو جس طرح ممکن ہو وہاں سے خریداری کرنے سے روکتے تھے' اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کرتے تھے' نیز دوکانداروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ایسی اشیاء اپنی دکانوں میں نہ رکھیں' اگر وہ نہ مانیں تو ان کو نقصان پہنچاتے تھے خواہ اس دکاندار کے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہو' اور اس تجارت کے بند کرنے سے اس کے اہل و عیال پر فاقوں کی نوبت آجائے' حضرت ان طریقوں کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

> "یہ واقعہ بھی متعدد گناہوں پر مشتمل ہے' ایک مباح فعل کے ترک پر مجبور کرنا بجز بعض خاص تجارتوں کے سبب اشیاء کی خرید و فروخت کا معاملہ اہل حرب تک کے ساتھ بھی جائز ہے چہ جائیکہ معاہدین کے ساتھ ... دوسرے بعد اتمام بیع کے واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیونکہ بدون قانون خیار کے یہ واپسی بھی شرعاً مثل بیع کے ہے جس میں تراضی متعاقدین شرط ہے' تیسرے نہ ماننے والوں کو ایذا دینا جو ظلم ہے' چوتھے اہل و عیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے' پانچویں اگر اس کو واجب شرعی بتلایا جاوے تو شریعت کی تغییر و تحریف ہونا......"

اس کے بعد حضرت ہڑتال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> "اس میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۳ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات مذکورہ میں شرکت نہ کرنے پر ایذاء جسمانی کی بھی نوبت آجاوے تو یہ گناہ ہونے میں اضرار مالی سے بھی اشد اور منافی اقتضائے اسلام ہے...... پھر ان مقاطعات پر مجبور کرنے میں یہ جابرین خود اپنے تسلیم کردہ قانون حریت کے بھی خلاف کر رہے ہیں ورنہ کیا وجہ کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں

اور دوسروں کی آزادی کو سلب کریں۔"

(معاملة المسلمین ۳ افادات اشرفیہ ص ۲۷و۲۸)

اس کے علاوہ حضرت نے ہڑتال ہی کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ "تلیین العرائک" کے نام سے لکھا ہے جس کا اصل موضوع تو تعلیمی اداروں میں طلبہ کی ہڑتال ہے لیکن اس میں مطلق ہڑتال کے بارے میں بھی اصولی بحثیں آگئی ہیں' اس رسالے کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہڑتال کا مروجہ طریق کار شریعت کے خلاف اور ناجائز ہے۔

(ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ ص ۳۰۱ ج ۶)

بھوک ہڑتال

اسی طرح مطالبات منوانے کے لئے ایک طریقہ بھوک ہڑتال کا بھی اختیار کیا جاتا ہے اس کے بارے میں حضرت سے سوال کیا گیا تھا کہ "اگر کوئی گرفتار ہو جائے ان میں سے بعضے لوگ جیل جانے میں مقاطعہ جوعی کرتے ہیں یہاں تک کہ مرجاتے ہیں اور قوم میں ان کی مدح کی جاتی ہے"۔ حضرت نے اس کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

"اس کا خودکشی اور حرام ہونا ظاہر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

ولا تقتلوا أنفسكم ' وفي الهداية كتاب الإكراه: فيأثم كما في حالة المخمصة و في العناية : فامتناعه عن التناول كامتناعه من تناول الطعام الحلال حتى تلفت نفسه او عضوه فكان آثما...... الخ

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جان بچانا اس درجہ فرض ہے کہ اگر حالت اضطرار میں اندیشہ مرجانے کا ہو' اور مردار کھانے سے جان بچ سکتی ہو کہ اس کا نہ کھانا اور جان دے دینا معصیت ہے' چہ جائیکہ طعام حلال کا ترک اور اس فعل کی مدح کرنے میں

تو اندیشہ کفر ہے۔ کہ صریح تکذیب ہے شریعت کی کہ شریعت
جس فعل کو مذموم کہتی ہو' یہ اس کو محمود کہتا ہے"

(افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۲۸و۲۹' نمبر ۲)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ (بھوک ہڑتال) خودکشی کے مترادف ہے اگر موت واقع ہو
جائے گی تو وہ موت حرام ہوگی۔"

(الافاضات الیومیہ ص ۳۰ ج ۳ ملفوظ نمبر ۳۰)

پبلسٹی کے مروجہ ذرائع:

آج کی سیاست میں پبلسٹی اور پروپیگنڈہ کو بھی نہایت اہم مقام حاصل ہے' اور اس سلسلے میں عموماً مغربی سیاست کے ایک مشہور نمائندے گوئبلز کے اس مقولے پر عمل کیا جاتا ہے کہ:

"جھوٹ اتنی شدت سے بولو کہ دنیا اسے سچ جان لے"۔

آج کل کی حکومتیں ہوں' یا لادینی سیاسی جماعتیں وہ تو اس اصول پر عمل کرتی ہی ہیں' لیکن بسا اوقات اسلام کے لئے سیاسی جدوجہد کرنے والے حضرات بھی اس چھائے ہوئے ماحول سے متاثر ہو کر پبلسٹی اور پروپیگنڈے کے مروجہ ذرائع استعمال کرنا شروع دیتے ہیں' اور ان کے جائز و ناجائز ہونے کی طرف یا تو دھیان نہیں جاتا یا پھر وہی نظریہ کار فرما ہوتا ہے کہ سیاست کی اصلاح ایک بلند مقصد ہے' اور اس کے حصول کے لئے چھوٹے چھوٹے امور کی قربانی دی جاسکتی ہے۔ غلط بیانی تو حرام ہے ہی لیکن سیاسی مخالفین کی بلاوجہ غیبت' ان کے خلاف ناجائز بدگوئی' ان پر بہتان و افتراء اور تحقیق کے بغیر افواہیں پھیلانا' یا ان پر تحقیق کے بغیر یقین کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہماری سیاسی تحریکات میں شعوری یا غیر شعوری طور پر داخل ہوگئی ہیں' اور ان کی وجہ سے افتراق و انتشار' پارٹی

بندیوں اور فتنہ و فساد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی تصانیف اور مواعظ و ملفوظات میں اس طریق کار پر بھی تنقید فرمائی ہے' اور ایسی سیاسی تدبیروں کو ناجائز اور واجب الترک قرار دیا ہے جو ان مفاسد پر مشتمل ہوں۔

اسی طرح جلسے جلوس بھی پبلسٹی اور اپنے نقطہ نظر کو عوام تک پہچانے کا اہم ذریعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن ان میں بھی بعض اوقات احکام شرعیہ کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اس کے بارے میں حضرت ؒ فرماتے ہیں:۔

> "جب کوئی تدبیر تدابیر منصوصہ کے خلاف اختیار کی جاوے گی اس کو تو ممنوع ہی کہا جاوے گا۔ خصوص جبکہ وہ فعل عبث یا مضر بھی ہو تو اس کی حرمت میں پھر کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ وہاں تو **الضرورات تبیح المحظورات** کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا مثلاً ہڑتال میں جلوس ہیں ان میں وقت کا ضائع ہونا' روپیہ کا صرف ہونا' حاجت مند لوگوں کو تکلیف ہونا' نمازوں کا ضائع ہونا کھلے مفاسد ہیں تو یہ افعال کیسے جائز ہو سکتے ہیں؟ (ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر نیت امداد حق کی ہو؟ تو فرمایا کہ) ان باتوں سے حق کو کوئی امداد نہیں پہنچتی' دوسرے نامشروع فعل نیت سے مشروع نہیں ہو جاتا"۔

(الافاضات الیومیہ ص۱۳۶ ج۵ ملفوظ نمبر ۱۵۲)

مروجہ سیاسی تدابیر کے بارے میں ایک اور موقع پر آپ نے اپنا نقطۂ نظر واضح فرمایا ہے' آپ سے پوچھا گیا تھا کہ "جتھے (حکومت کے) مقابلے کے لئے جاتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں' خاموش مقابلہ کرتے ہیں' اگر حکومت کی طرف سے تشدد بھی ہو تب بھی جواب نہیں دیا جاتا۔ ان صورتوں کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:۔

"عقلی دو ہی احتمال ہیں' یا تو مقابلے کی قوت ہے یا قوت نہیں 'اگر قوت ہے تو گرفتار ہونے کے کیا معنی؟ مقابلہ کرنا چاہیے' اور جب مقابلہ نہیں کر سکتے تو یہ صورت عدم قوت کی ہے جیسا کہ ظاہر ہے تو عدم قوت کی حالت میں قصداً ایسی صورت اختیار کرنے کی خود ضرب و جس میں مبتلا ہو شریعت اجازت نہیں دیتی بلکہ ایسے مخترع مقابلے کے مکارہ (ناگوار امور) پر صبر پر سے کام لینا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ اگر قوت ہے مقابلہ کرو' اگر قوت نہیں صبر کرو ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری صورت منقول نہیں۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں:-

"اس وقت سب سے بڑی وجہ ناکامی کی یہی ہوئی کہ مسلمانوں کے سر پر کوئی بڑا نہیں' نہ مسلمانوں کی قوت کسی مرکز پر جمع ہے اور نہ ہو سکتی ہے جب تک کہ بالاتفاق ایک کو بڑا نہ بنالیں۔ اگر امام ہو تو سب کام ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اس کے حکم سے میدان میں جاویں' اگر جان بھی جاتی رہے تو کوئی حرج نہیں' اور یہ کیا کہ بیٹھے بیٹھے جا کر قتل ہو جاویں' یہ کوئی انسانیت ہے؟ اصل بات وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ خیر القرون میں دو ہی صورتیں تھیں کہ قوت کے وقت مقابلہ' اور عدم قوت کے وقت صبر' اس کے سوا سب من گھڑت تدابیر ہیں۔ اس لئے ان میں خیر و برکت نہیں ہو سکتی' اور جب خیر و برکت نہ ہو اور مسلمان ظاہراً کامیاب بھی ہو جائیں تو اس کامیابی پر کیا خوشی جو اللہ اور رسول ﷺ کی مرضی کے خلاف تدابیر اختیار کر کے کامیابی حاصل کی جاوے اور حسی کامیابی کا ہو جانا تو کوئی کمال کی بات نہیں' اس

لئے کہ ایسی کامیابی کافروں کو بھی ہو جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کی اصل کامیابی تو وہ ہے کہ چاہے غلامی ہو، مگر خدا راضی ہو، اور اگر حکومت ہوئی اور ان کی مرضی کے خلاف ہوئی، وہ راضی نہ ہوئے تو فرعون کی حکومت اور تمہاری حکومت میں کیا فرق ہوا؟ بس ان کے راضی کرنے کی فکر کرو، ان سے صحیح معنوں میں تعلق کو جوڑو، اسلام اور احکام اسلام کی پابندی کرو، ان بتوں کا اتباع تو بہت دن کر کے دیکھ لیا۔ اب خدا کے سامنے سر رکھ کر اور اس سے اپنی حاجت اور ضروریات کو مانگ کر بھی دیکھ لو کہ کیا ہوتا ہے؟"

(الافاضات الیومیہ ص ۲۸ و ۲۹ ج ۵ ملفوظ نمبر ۱۹۰)

حکومت کے ساتھ طرزعمل

اسلام نے اپنے احکام میں اصل زور اس بات پر دیا ہے کہ ہر حالت میں احکام شریعت کی اتباع کی جائے، اگر حاکم وقت کی طرف سے خلاف شرع امور کا حکم دیا جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں۔ بلکہ جب تک اکراہ کی شرعی حالت متحقق نہ ہو، شریعت کے احکام پر عمل ضروری ہے، اس راستے میں جتنی تکلیفیں پیش آجائیں ان پر صبر کرنا چاہیے کہ وہ موجب اجر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی حاکم شریعت کے خلاف کام کر رہا ہے تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کی شرائط کے ساتھ انجام دینا بھی ضروری ہے اور ضرورت کے وقت اس کے سامنے اظہار حق بھی، جسے حدیث میں "افضل الجہاد" قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام کام شریعت کے عین مطابق ہیں بشرطیکہ شرعی حدود میں ہوں اور پیش نظر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور دین حق کی تبلیغ و نصرت ہو، محض اپنی بہادری جتانا، لوگوں سے داد حاصل کرنا، یا خود طلب اقتدار پیش نظر نہ ہو۔

لیکن آج کی سیاسی فضا میں یہ معاملہ بھی شدید افراط و تفریط کا شکار ہے جو لوگ حزب اقتدار سے وابستہ یا حکومت کے طرف دار ہوتے ہیں' وہ ہر حال میں حکومت کی تعریفوں کے پل باندھے رکھتے ہیں اور اس کے ہر جائز و ناجائز فعل کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ حکومت کے ناجائز یا ظالمانہ اقدامات کو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں پھر بھی خاموش رہتے ہیں اور اور ان کی تاویلات تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جو صریح مداہنت ہے اور بعض لوگ تو ان ناجائز اقدامات کی حمایت کے لئے تحریف دین تک سے دریغ نہیں کرتے اور دوسری طرف جو لوگ "حزب اختلاف" سے وابستہ یا حکومت کے مخالف ہیں وہ "حکومت کی مخالفت" کو بذات خود ایک مقصد بنا لیتے ہیں اور اسے سیاسی فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر حزب اختلاف یہ بات اپنے فرائض منصبی میں سے سمجھتی ہے کہ وہ حکومت کی ہر بات میں کیڑے نکالے اور اس کی کسی اچھائی کا اعتراف نہ کرے۔ اس طرز عمل کا مقصد بسا اوقات حق کی نصرت کے بجائے حکومت کو بدنام کر کے اپنے اقتدار کا راستہ ہموار کرنا اور عوام سے بہادری کی داد حاصل کرنا ہوتا ہے۔

عوام میں بھی حکام کو وقت بے وقت برا بھلا کہنے اور انہیں گالیاں تک دینے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ جلوسوں میں سربراہان حکومت کو "کتا" اور "سور" تک بنا کر ان کے خلاف ہائے ہائے کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مجلسوں میں ایک مشغلے کے طور پر حکام کا ذکر کر کے ان کی برائیاں کی جاتی ہیں۔ جو کسی معقول وجہ کے بغیر ہونے کی وجہ سے غیبت میں تو داخل ہیں ہی' بعض اوقات افتراء اور بہتان کی حدود میں بھی داخل ہو جاتی ہیں' اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کو برا کہنا غیبت میں داخل نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس طرز عمل پر بھی تنقید فرمائی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:-

> "حجاج بن یوسف اس امت کا سب سے بڑا ظالم مشہور ہے مگر کسی بزرگ کی مجلس میں ایک شخص نے اس پر کوئی الزام لگایا اور غیبت کی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اگرچہ ظالم و فاسق ہے۔ مگر حق

تعالٰی کو اس سے کوئی دشمنی نہیں وہ جس طرح دوسرے
مظلوموں کا انتقام حجاج سے لے گا' اسی طرح اگر کوئی حجاج پر ظلم
کرے گا تو اس سے بھی انتقام لیا جائے گا"۔

(مجالس حکیم الامت ص ۹۲' ملفوظات رمضان ۱۳۴۸ھ)

اس کے علاوہ حضرت نے کئی مقامات پر یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی ضرورت کے بغیر حکام کی علی الاعلان اہانت شرعاً پسندیدہ بھی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"سلاطین اسلام کی علی الاعلان اہانت میں ضرر ہے جمہور کا ہیبت
نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں' اس لئے سلاطین اسلام کا احترام کرنا
چاہیے"۔

(انفاس عیسیٰ ص ۳۴۹ ج ا باب ۴)

حضرت حکیم الامت کی یہ بات در حقیقت سرکار دو عالم ﷺ کے اس ارشاد کی شرح ہے جو حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:۔

"من أراد أن ینصح لذی سلطان بأمر فلا یبدلہ علانیۃ' ولکن لیأخذ بیدہ فیخلو بہ فإن قبل منہ فذاک' وإلا کان قد أدی الذی علیہ"

جو شخص کسی صاحب اقتدار کو کسی بات کی نصیحت کرنا چاہے تو
اس نصیحت کو علانیہ ظاہر نہ کرے' بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر خلوت
میں لے جائے اگر وہ اس کی بات قبول کر لے تو بہتر ورنہ اس نے
اپنا فرض ادا کر دیا۔

(مجمع الزوائد ص ۲۲۹ ج ۵ بحوالہ مسند احمد و رجالہ ثقات)

ایک اور وعظ میں حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں:۔

"بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ ہو کر حکام وقت کو برا بھلا

کہتے ہیں' یہ بھی علامت ہے بے صبری کی' اور پسندیدہ تدبیر نہیں'
اور حدیث شریف میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے فرماتے ہیں :
"لا تسبوا الملوک" یعنی بادشاہوں کو برا مت کہو' ان کے
قلوب میرے قبضے میں ہیں میری اطاعت کرو' میں ان کے دلوں
کو تم پر نرم کر دوں گا"۔

(وعظ الصبر ص ۳۶' ماخوذ از اصلاح المسلمین ص ۵۲۲)

جس حدیث کی طرف حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے وہ مختلف صحابہ کرامؓ سے مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کے یہ الفاظ مروی ہیں:-

لاتشغلوا قلوبکم لسب الملوک' ولکن تقربوا إلی
اللّٰہ تعالیٰ بالدعاء لھم یعطف اللّٰہ قلوبھم علیکم "۔
ترجمہ :- "اپنے دل بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ
کرو۔ بلکہ ان کے حق میں دعا کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو
' اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ فرمادیں گے۔"

(کنز العمال ص ج ۶' حدیث ۹ بحوالہ ابن النجار)

اور حضرت ابو الدرداء ﷺ سے یہ الفاظ منقول ہیں:-

"إن اللّٰہ یقول أنا اللّٰہ لا إلٰہ إلّا أنا' مالک الملک و
ملک الملوک' قلوب الملوک بیدی ' وإن العباد إذا
أطاعونی حولت قلوب ملوکھم علیھم با لرأفۃ
والرحمۃ ' وإن العباد إذا عصونی حولت قلوبھم
علیھم با لسخط والنقمۃ ' فساموھم سوء العذاب' فلا
تشغلوا أنفسھم بالدعاء علی الملوک ' ولکن إشغلوا

أنفسكم بالذكر والتضرع أكفكم ملوككم"

ترجمہ:۔"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں' میرے سوا کوئی معبود نہیں' میں مالک الملک ہوں' اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں' بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں' اور بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو ان کی طرف رحمت و رافت سے متوجہ کر دیتا ہوں' اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے دلوں کو ان کے خلاف ناراضی اورر عذاب کے ساتھ متوجہ کر دیتا ہوں' چنانچہ وہ انہیں بدترین اذیتیں پہنچاتے ہیں' لہٰذا تم بادشاہوں کو بد دعائیں دینے میں مشغول نہ ہو' بلکہ اپنے آپ کو ذکر اور دعا و تضرع میں مشغول رکھو' میں تمہارے بادشاہوں کے معاملے میں تمہاری مدد کروں گا"۔

(مجمع الزوائد ص۲۴۹' ج۵ بحوالہ' طبرانی' وفیہ ابراہیم بن راشد' وھو متروک)

اور حضرت ابو امامہ ﷺ سے یہ الفاظ مروی ہیں:۔

"لا تسبوا الأئمة وادعوا الله لهم بالصلاح فإن صلاحهم لكم صلاح"۔

ترجمہ:۔"ائمہ (سربراہان حکومت) کو برا بھلا نہ کہو' بلکہ ان کے حق میں نیکی کی دعا کرو۔ کیونکہ ان کی نیکی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

(**السراج المنير للعزيزي** ص۱۱۴ ج۴' وقال: اسنادہ حسن)

بہرصورت! حکام کو بلا ضرورت برا کہنے کو مشغلہ بنالینا شرعاً پسندیدہ نہیں ہے' اگر وہ اتنے برے ہوں کہ ان کے خلاف خروج (بغاوت) جائز ہو تو پھر شرعی احکام کے

مطابق خروج کیا جائے' (جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آرہی ہے) لیکن بد گوئی کو شیوہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ غیبت کے نقصان کے علاوہ حضرت حکیم الامت نے اس بد گوئی کے ایک اور نقصان کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے' اور وہ یہ کہ حکومت کی فی الجملہ ہیبت امن و امان کے قیام کے لئے ضروری ہے اور جب یہ ہیبت دلوں سے اٹھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ مجرموں کی بے باکی کی صورت میں نکلتا ہے ملک میں بد امنی پھیلتی ہے' اور اس کا نقصان پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔

حکومت کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف چارہ کار

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہڑتال 'بھوک ہڑتال اور احتجاج کی مروجہ بیشتر صورتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے تو موجودہ حکومتوں کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف امت کے پاس چارہ کار کیا رہ جاتا ہے؟ کیا موجودہ حکومتوں کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اسلامی احکام کو پامال کرتی رہیں؟ لوگوں کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے برگشتہ کرنے کے لئے حکومت کی پوری مشینری کو استعمال کرتی رہیں؟ تعلیم گاہوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے غیر اسلامی نظریات کی ترویج جاری رہے؟ اور جو مسلمان دین پر عمل کرنا چاہتے ہیں وہ زبانی وعظ و نصیحت کے سوا کچھ نہ کریں؟ جبکہ آج کل کی حکومتوں کا تجربہ ہے کہ وہ زبانی وعظ و نصیحت کو در خور اعتناء نہیں سمجھتیں اور جب تک ان پر احتجاج کا دباؤ نہ ڈالا جائے اس وقت تک وہ کسی مطالبے کو عموماً تسلیم نہیں کرتیں۔

اس سوال کا جواب حضرت حکیم الامت کے ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ مغربی سیاست کے رواج عام کے سبب ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ احتجاج

کا طریقہ ہڑتالوں، جلوسوں اور مظاہروں ہی میں منحصر ہے حالانکہ ایک مسلمان کو احتجاج کا طریقہ بھی خود اپنے دین کے احکام ہی سے لینا چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کے غیر اسلامی اقدامات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جہاں حکومت کے خلاف خروج (مسلح بغاوت) جائز ہو جائے تو وہاں خروج کے احکام جاری ہوں گے (جن کی کچھ تفصیل آگے آ رہی ہے) لیکن جہاں خروج جائز نہ ہو، وہاں وعظ و نصیحت کے علاوہ مسلمانوں کے پاس احتجاج کا ایک طریقہ ایسا ہے، جو بڑی بڑی حکومتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہے اور وہ طریقہ ہے:-

"لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق"۔

یعنی! "خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں"۔

اور یہ طریقہ خود سرکار دو عالم ﷺ کے ایک ارشاد سے ثابت ہوتا ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"خذوا العطاء ما دام عطاء، فإذا صار رشوۃ علی الدین فلا تأخذوہ، ولستم بتارکیہ یمنعکم الفقر والحاجۃ، ألا إن رحی الإسلام دائرۃ، فدوروا مع الکتاب حیث دار، ألا ان الکتاب و السلطان سیفترقان، فلا تفارقوا الکتاب ألا إنہ سیکون علیکم أمراء لقضون لأنفسهم ما لا یقضون لکم فإن عصیتموهم قتلوکم، وإن أطعتموهم أضلوکم، قالوا یا رسول اللّٰہ کیف نصنع؟ قال کما صنع أصحاب عیسیٰ بن مریم نشروا بالمناشیر، وحملوا علی الخشب، موت فی طاعۃ اللّٰہ خیر من حیاۃ فی معصیۃ اللّٰہ۔

تنخواہ اس وقت تک لو جب تک وہ تنخواہ رہے، لیکن اگر وہ دین (فروشی) کے اوپر رشوت بن جائے تو نہ لو اور تم فقر اور حاجت

کے خوف سے اسے چھوڑو گے نہیں' خوب سن لو کہ اسلام کی
چکی چل چکی ہے لہٰذا قرآن جہاں بھی جائے تم اس کے ساتھ جاؤ۔
خبردار قرآن اور اقتدار دونوں الگ الگ ہو جائیں گے ایسے
میں تم قرآن کا ساتھ نہ چھوڑنا' یاد رکھو کہ تم پر کچھ ایسے امراء
آئیں گے جو اپنے حق میں وہ فیصلے کریں گے جو تمہارے حق میں
نہیں کریں گے۔ اگر تم نے ان کی خلاف ورزی کی تو وہ تمہیں
قتل کر دیں گے اور اگر تم نے ان کے اطاعت کی تو وہ تمہیں گمراہ
کر دیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول
اللہ! ہم ایسے میں کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہی کرو جو
عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا' ان کو آروں سے چیر دیا
گیا اور لکڑیوں پر اٹھایا گیا۔ اللہ کی اطاعت میں موت آجائے تو
وہ اللہ کی نافرمانی میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔

(مجمع الزوائد ص۲۳۸ جلد۵' بحوالہ طبرانی' وقال الہیثمی یزید بن مرثد لم یسمع من معاذ
والوضین بن عطاء وثقہ ابن حبان وغیرہ وضعفہ جماعۃ' وبقیۃ رجالہ ثقات)

اس حدیث نے واضح فرمادیا کہ اگر کبھی حکومت وقت کی طرف سے ایسے
احکام جاری کئے جائیں جو اللہ کی کتاب کے صراحتاً" خلاف ہوں (جن میں اسلام کے تمام
قطعی اور منصوص احکام داخل ہیں) تو ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ان حکام کے بجائے
اللہ کے حکم کی پابندی کرے' یہ طریق کار جہاں انفرادی طور پر اور اخروی نجات کا راستہ
ہے' وہاں اس میں اجتماعی اصلاح کی بھی زبردست صلاحیت ہے کیونکہ اب اگر عوام میں یہ
عام دینی شعور پیدا کر دیا جائے کہ وہ خالص اپنے دینی جذبے سے حکومت کے غیر اسلامی
احکام کی تنفیذ میں حصہ دار بننے سے ہاتھ روک لیں تو ایک حکومت پر اس سے بڑے کسی
دباؤ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تصور فرمایئے کہ اگر مسلمان اپنے دینی شعور کے تحت یہ فیصلہ

کر لیں کہ وہ بینکوں کے سودی کھاتوں میں رقمیں نہیں رکھوائیں گے۔ ملازمین یہ طے کر لیں کہ وہ سودی بینکوں کی ملازمت چھوڑ دیں گے' اور تجار یہ طے کر لیں لہ وہ کسی بینک سے سود پر قرض نہیں لیں گے' تو کیا یہ سودی نظام ایک دن باقی رہ سکتا ہے؟ اگر مسلمان جج یہ طے کر لیں کہ وہ کسی غیر اسلامی قانون کے تحت فیصلہ نہیں کریں گے۔ اور اس کے لئے ملازمت چھوڑنی پڑے تو چھوڑ دیں گے۔ وکلاء یہ طے کر لیں کہ وہ کسی غیر اسلامی قانون کے تحت کسی مقدمے کی پیروی نہیں کریں گے خواہ انہیں کتنے مالی فوائد سے ہاتھ دھونے پڑیں تو کیا یہ غیر اسلامی قوانین عوام کے سروں پر مسلط رہ سکتے ہیں؟ اگر مسلمان سرکاری ملازمین یہ عزم کر لیں کہ وہ حکومت کے کسی غیر اسلامی اقدام کی تنفیذ میں حصہ دار بننا گوارہ نہیں کریں گے اور اگر انہیں ایسا کرنا پڑا تو وہ ملازمت سے مستعفی ہو جائیں گے تو کیا یہ غیر اسلامی اقدامات باقی رہ سکتے ہیں؟

احتجاج کے مروجہ طریقوں کے مقابلے میں اس تجویز میں صرف یہ خرابی ہے کہ یہ مغربی سیاست کے ٹکسال سے ڈھل کر نہیں نکلی اس لئے ذہنوں کے لئے اچنبھی اور نامانوس ہے لیکن اگر اس تجویز پر ٹھیک ٹھیک عمل کر لیا جائے تو اس میں ملک کا نظام بدلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے' اور یہ مروجہ تدابیر کے مفاسد سے بھی خالی ہے۔ ہاں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے دل میں خدا کا خوف' آخرت کی فکر' اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس' اور اتباع شریعت کی لگن موجود ہو۔ اور وہ پہلے اپنے ذات پر اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے تیار ہوں۔

اس کے برعکس مروجہ طریق کار لوگوں کو اس لئے آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی ذات پر اسلام کی کوئی پابندی عائد کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے' جس شخص کی ذاتی زندگی اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے خالی ہو' وہ بھی نفاذ اسلام کا جھنڈا بلند کر کے سڑکوں پر نعرے لگا سکتا ہے' اس طریق کار میں "اسلامی جذبے" کے اظہار کے لئے ایک دن ہڑتال میں حصہ لے لینا کافی ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ دکانوں اور دفتروں

میں بیٹھ کر خالص غیر اسلامی معاملات اپنے ہاتھوں سے طے کئے جا رہے ہوں تو اس سے اس جدوجہد پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خود اپنی ذاتی زندگی پر اسلامی احکام نافذ نہ کر سکتے ہوں وہ کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ نفاذ اسلام کے لئے ان کی جدوجہد اور ان کے مطالبات پورے ہو جائیں گے؟ اس عظیم کام کے لئے اتنی شرط تو ہونی چاہئے کہ جو لوگ اس جدوجہد کا بیڑا اٹھائیں' کم از کم وہ تو اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہوں اور اس راہ میں جان و مال اور جذبات و مفادات کی قربانی پیش کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ اگر یہ بنیادی شرط ہی مفقود ہے تو نفاذ اسلام کی جدوجہد کی حیثیت و اہمیت ایک بے جان اور سطحی شورش سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

حکومت کے خلاف خروج

سرکار دو عالم ﷺ نے اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کو شدید جرم قرار دیا ہے اور باغی کی سزا موت قرار دی ہے۔ چنانچہ اس بات پر فقہاء کرام کا اجماع ہے کہ حکومت عادلہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ البتہ ایک ظالم یا غیر اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کس وقت جائز ہوتی ہے؟ اس مسئلے میں فقہاء امت نے کافی مفصل بحثیں کی ہیں یہ بات تو احادیث سے واضح ہے کہ اگر حکمران سے کفر بواح (واضح کفر) کا صدور ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت بالکل برحق ہے لیکن اگر اس سے فسق و فجور سرزد ہو تو اس صورت میں عموماً فقہاء بغاوت کو جائز نہیں کہتے کیونکہ حدیث میں صرف کفر بواح کی صورت میں بغاوت کی اجازت دی گئی ہے' لیکن دوسری طرف بعض احادیث کے کچھ الفاظ اس کے خلاف بھی نظر آتے ہیں۔ جن سے حکمران کے فسق کی صورت میں خروج کی گنجائش معلوم ہوتی ہے' اسی بناء پر بعض فقہاء کی عبارتیں بھی متضاد سی نظر آتی ہیں۔ خود راقم الحروف کو اس مسئلے میں ایک مدت تک بہت اشکال رہا' اور کوئی منقح بات سامنے نہیں آئی۔

لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اس موضوع پر ایک نہایت جامع مفصل اور مدلل رسالہ تحریر فرمایا ہے جو امداد الفتاویٰ کی پانچویں جلد میں "جزل الکلام فی عزل الامام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں حضرت نے اس موضوع کی تمام احادیث اور فقہاء کرام کے اقوال کو یکجا جمع کر کے اس مسئلے کو اتنا منقح فرما دیا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر بحث احقر کی نظر سے نہیں گذری۔ حضرت نے مسئلے کی تمام صورتوں کا تجزیہ فرما کر ہر صورت کا حکم احادیث اور فقہی حوالوں کے ذریعے واضح فرمایا ہے۔ حضرت کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمران کے غیر اسلامی اقدامات کی چند صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم جدا ہے۔

(۱)..... حکمران کا فسق اس کی ذات کی حد تک محدود ہو، مثلاً شراب نوشی وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ:

> "اگر بدون کسی فتنے کے آسانی سے جدا کر دینا ممکن ہو، جدا کر دیا جائے، اگر فتنے کا اندیشہ ہو صبر کیا جائے۔۔۔۔۔۔ اور اگر نہی عن العزل کی صورت میں اس پر کوئی خروج کرے تو عامہ مسلمین پر اس کی نصرت واجب ہے خاص کر جب امام بھی حکم کرے۔ لقولہ فی العبارۃ السادسۃ فاذا خرج جماعۃ مسلمون۔۔۔ الخ"۔

(۲)..... دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا فسق دوسروں تک متعدی ہو۔ یعنی لوگوں کا مال ناحق طریقے سے لینے لگے، لیکن اس میں اشتباہ جواز کا بھی ہو سکتا ہو۔ جیسے مصالح سلطنت کے نام سے ٹیکس وغیرہ وصول کرنے لگے۔ اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں اس کی اطاعت ہی واجب ہے خروج جائز نہیں۔

(۳)..... ایسا مالی ظلم کرے جس میں جواز کا شبہ بھی نہ ہو۔ بلکہ صریح ظلم ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ:۔

''اپنے اوپر سے ظلم کا دفع کرنا' اگرچہ قتال کی نوبت آجائے۔۔

۔۔۔۔ اور صبر بھی جائز ہے۔ بلکہ غالباً اولیٰ ہے۔۔۔۔۔۔''۔

(۴)..... لوگوں کو معصیتوں پر مجبور کرے' مگر اس کا منشاء دین کا استخفاف یا کفر و معصیت کی پسندیدگی نہ ہو' تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر اکراہ کے وہ احکام جاری ہوں گے جو فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ لیکن خروج جائز نہ ہو گا۔

(۵)..... لوگوں کو معصیت پر مجبور کرے۔ اور اس کا منشاء دین کا استخفاف یا کفر و معصیت کی پسندیدگی ہو تو یہ کفر ہے' یا اگرچہ فی الحال تو اکراہ کا منشاء استخفاف وغیرہ نہ ہو' لیکن اکراہ عام بشکل قانون ایسے طور پر ہو کہ ایک مدت تک اس پر عام عمل ہونے سے فی المال ظن غالب ہو کہ طبائع میں استخفاف پیدا ہو جائے گا تو ایسا اکراہ بھی بحکم کفر ہے' اور ان تمام صورتوں میں وہی حکم ہو گا جو کفر بواح کا ہے اور جو چھٹی صورت میں آرہا ہے۔

(۶)..... نعوذ باللہ کافر ہو جائے' اور اس کا حکم یہ ہے کہ:۔

''معزول ہو جائے گا اور اگر جدا نہ ہو' بشرط قدرت جدا کر دینا علی الاطلاق واجب ہے مگر اس میں شرط یہ ہے کہ وہ کفر متفق علیہ ہو۔ اور جس طرح اس کا کفر ہونا قطعی ہو۔ اسی طرح اس کا صدور بھی یقینی ہو۔ مثل رویت عین کے' نہ کہ محض روایات ظنیہ کے درجے میں' کما دل علیہ قولہ علیہ السلام: إلا أن تروا المراد بہ رؤیۃ العین بدلیل تعدیۃ إلی مفعول واحد۔

کسی امر موجب کفر کی دلالت علی الکفر یا اس امر موجب کفر کا ثبوت قرائن مقامیہ یا مقالیہ کے اختلاف سے مختلف فیہ ہو سکتا ہے' اور خود قطعیت بھی مختلف فیہ ہو سکتی ہے اسی طرح کبھی اجماع مختلف فیہ ہو سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس صورت میں ہر عامل اپنے عمل میں معذور ہو گا۔ اسی طرح

ایک صورت میں بھی رائے کے اختلاف میں مساغ ہے' وہ یہ کہ عبارت خامسہ میں تعارض مصالح کے وقت اخف المفسدتین کے تحمل کا حکم کیا گیا ہے' تو ممکن ہے کہ دو شخصوں کا اجتہاد مضرات مختلفہ کے اخف و اشد ہونے میں مختلف ہو۔ وبہ یخل کثیر من الإشکالات من اختلاف جماعات الثقات فی مثل ھذہ المقالات۔

(امداد الفتاویٰ ص ۳۰ ج ۵)

پھر جن صورتوں میں خروج کی اجازت یا وجوب بیان کیا گیا ہے ان میں شرط ہے کہ خروج کے لئے مناسب قوت موجود ہو۔ اور اس کے نتیجے میں کسی اور بدتر حکمران کے مسلط ہو جانے یا کسی غیر مسلم طاقت کے قبضہ جما لینے کا اندیشہ نہ ہو۔

یہاں حضرت ﷫ کی تحقیق کا نہایت اجمالی خلاصہ پیش کیا گیا ہے' ورنہ حضرت ﷫ نے ہر صورت کے حکم کو حدیث اور فقہ کے دلائل سے مبرھن فرمایا ہے' اور تمام ممکنہ شبہات کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔ اہل علم کے لئے یہ رسالہ نہایت مفید اور اطمینان بخش ہے۔

فھذا آخر ما أردنا إیرادہ فی ھذہ العجالۃ' و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سیدنا و مولانا محمد النبی الأمین و علیٰ آلہ و أصحابہ أجمعین۔

☆☆☆...☆☆☆...☆☆☆